Registered No. L. 4186

ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ — جلد ۱۲ — عدد ۴

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دارالاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

قیمت سالانہ پانچ روپے — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہُوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بروقت اُن کو شکایت کرنی چاہیئے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

منیجر

نرخنامہ و قواعدِ اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عـہ۱۰	عہ۲۵	للعہ۴۵	لـہ
نصف صفحہ	ـ۶	عہ۱۵	عہ۲۵	للعہ۴۵
ربع صفحہ	للعہ۴	عـہ۱۰	معہ۱۷	عہ۲۵

۱ - کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲ - اشتہار کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳ - صرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴ - نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵ - ٹائیٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

فہرستِ مضامین

ماہ ربیع الثانی ۵۷ھ - مطابق جون ۳۸ء - جلد ۱۲ - عدد ۴

باہتمام چودہری نیاز علی خاں صاحب پرنٹر و پبلشر گیلانی الکٹرک پریس لاہور
میں طبع ہو کر دارالاسلام (نزد پٹھان کوٹ) سے شائع ہوا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اشارات

اگر ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد انقلابی نوعیت کی ہوتی، اور اس کا مقصد فی الحقیقت یہ اور صرف یہ ہوتا کہ اُس ظالمانہ نظام حکومت کا قطعی خاتمہ کردیا جائے جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا ہے، اور اس ملک کے باشندے انگریزی اثر و اقتدار سے بالکلیہ آزاد ہو کر اپنی قسمت کا آپ فیصلہ کریں، تو کوئی کافر ہی ہوتا جو اس مقصد کے خلاف زبان کھولتا، اور اس کے حصول میں مددگار بننے سے انکار کرتا۔ اس صورت میں یہ سوال چھیڑنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی کہ انگریزی سلطنت کی عمارت کو توڑ کر جو دوسری عمارت بنائی جائیگی اس کا نقشہ کیا ہوگا۔ ہم بڑی آسانی کیساتھ اس امر پر متفق ہو سکتے تھے کہ پہلے لڑ کر اس بداصل عمارت کو توڑ ڈالو، پھر جو جماعت فکر و نظر اور قوتِ اثر کے لحاظ سے غالب تر ہوگی اسی کے تجویز کردہ نقشہ پر نئی عمارت بن جائیگی۔ مستقبل کے سوال کو ہم آزادانہ مقابلہ اور اس کے نتیجہ پر چھوڑ دینے کے لیے بڑی خوشی کے ساتھ تیار ہو سکتے تھے، اور اگر تیار نہ ہوتے تو یہ یقیناً ہماری بزدلی اور اعتماد علی النفس کی کمی پر دال ہوتا۔

لیکن جیسا کہ میں ثابت کر چکا ہوں، یہاں صورت حال یہ ہے ہی نہیں۔

یہاں جدوجہد کی نوعیت انقلابی نہیں بلکہ دستوری ہے۔ یعنی اس جنگ کا نقشہ یہ نہیں ہے کہ انگریزی سلطنت کے نظام کو توڑ ڈالا جائے، بلکہ نقشۂ جنگ دراصل یہ ہے کہ اسی نظام سلطنت کے اندر رہ کر حکمراں جماعت پر دباؤ ڈالا جائے اور بتدریج اس سے اختیارات حاصل کیے جائیں۔

اس قسم کی جنگ کا مقصد "آزادی کامل" نہ ہو سکتا ہے۔ اور نہ فی الواقع ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایسی جنگ میں جو چیز مل سکتی ہے اور جو درحقیقت مطلوب بھی ہے وہ سلطنت برطانیہ کے زیر سایہ حکومت خود اختیاری ہے۔ تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ اس طرح بھی آزادی کامل کا حصول ممکن ہے اور وہی مطلوب بھی ہے تو اسکی صورت یہ نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی کہ ایک نظام حکومت کلیتہً ختم ہو کر دوسرا نظام حکومت بعد میں نئے سرے سے قائم ہو۔ بلکہ دراصل اسکی صورت یہ ہے کہ ایک نظام حکومت کے اندر سے دوسرے نظام حکومت کا ارتقا تدریج کیساتھ ہو رہا ہے اور ہوتا رہیگا۔ پہلے پرامن جدوجہد سے غیر ملکی فرمانرواؤں پر دباؤ ڈالا گیا، پھر اس دباؤ سے کچھ اختیارات حاصل کیے گئے، پھر ان اختیارات کو استعمال کر کے ملک کو ایک خاص نقشہ پر تیار کرنا شروع کر دیا گیا۔ اس طریقہ سے جو طاقت حاصل ہو گی اسکو مزید دباؤ ڈالنے کیلیے استعمال کیا جائیگا تاکہ مزید اختیارات حاصل ہوں، اور جب وہ اختیارات حاصل ہو جائینگے تو ان کو پھر اسی نقشہ پر ملک کی تعمیر میں استعمال کیا جائیگا۔ پس اگر اس طرز کی دستوری ترقی سے آزادی کامل حاصل ہوئی بھی تو وہ اس وقت حاصل ہو گی جب انگریزی اسٹیٹ کی گود میں نشو ونما پاکر ہندوستانی اسٹیٹ درجۂ کمال کو پہنچ جائیگا اور ہندوستانِ جدید کی تعمیر جس نقشہ پر شروع کی گئی ہے اسی نقشہ پر وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہو گی۔

جب نقشۂ جنگ یہ ہے تو ابتدا ہی میں ہمارے لیے اس سوال پر غور کرنا لازم ہو جاتا ہے کہ یہاں نظام حکومت کا نشو و نما کس ڈھنگ پر ہو رہا ہے، اور اس کے تحت ہندوستان جدید کی تعمیر کس نقشہ پر کی جا رہی ہے۔ اس سوال کو قطعی نظر انداز کرنیکا تصور صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں، جو نام کے مسلمان ضرور ہیں، مگر جنکی نگاہ میں خود اپنے یا اپنی آئندہ نسلوں کے مسلمان رہنے یا نہ رہنے کا مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور اس سوال کو بعد کے لیے اٹھا رکھنے کا خیال صرف اُن دماغوں میں آسکتا ہے جنہیں خدا نے بصیرت سے قطعی محروم کر دیا ہے۔ باقی رہے وہ لوگ جو اپنے اور اپنی آئندہ نسلوں کے مسلمان رہنے کو اہم اور اقدم سمجھتے ہیں، اور جو ہندوستان کے جدید انقلاب میں نہ صرف اسلام کا بقا و تحفظ، بلکہ اسکی ترقی و سربلندی چاہتے ہیں، اور جن کو خدا نے عقل و بصیرت سے محروم نہیں کیا ہے، تو انکے نزدیک یہ سوال اِس وقت اور اِسی وقت چھیڑنے کا ہے، کیونکہ یہ ہندوستانی مسلمان کی زندگی اور موت کا سوال ہے اور اس کو بعد کے لیے اٹھا رکھنے کے معنی دراصل یہ ہیں کہ زندگی کے مسئلے کو موت کے انتظار میں ملتوی رکھا جائے، جس کا تصور بھی کوئی مرد عاقل نہیں کر سکتا۔

گذشتہ صفحات میں، میں نے اسی سوال سے بحث کی ہے، اور جو ناقابل انکار حقائق میں نے پیش کیے ہیں، ان سے تین باتیں قطعی طور پر ثابت ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ نظام حکومت کا ارتقا ایسے ڈھنگ پر ہو رہا ہے جس سے حکومت کا اقتدار انگریزی سنگینوں کی حمایت میں کلیۃً ہندو قوم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اور ہندوستان کی دوسری تمام قلیل التعداد قوموں کیلیے جن میں مسلمان بھی شامل ہیں، اس تغیر و انقلاب کی حیثیت اسکے سوا کچھ نہیں رہتی کہ وہ ممالیک کی طرح ایک آقا سے دوسرے آقا کے قبضے میں چلے جائیں۔

دوسرے یہ کہ اس نظام حکومت کے تحت ہندوستان جدید کی تعمیر ایسے نقشہ پر ہو رہی ہے جس میں ہماری تہذیب اور ہماری قومیت کیلیے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ جمہوریت اور پارٹی سسٹم کی بدولت جو اقتدار ہندی قوم پرستوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہو گیا ہے، اور آیندہ ہونیوالا ہے، اس کو ایک نئی ہندی قومیت بنانے کیلیے استعمال کیا جا رہا ہے، اور اس قومیت کی تخلیق کیلیے وہ تمام تدبیریں عمل میں لائی جا رہی ہیں جو قومیتوں کو فنا کرنے والی اور قوموں کو تہذیبی ارتداد پر مجبور کرنے والی ہیں۔

تیسرے یہ کہ زمانۂ حال کے تصورات سیاسی کے تحت حکومت کا دائرۂ اثر زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو گیا ہے، اور کوئی ایسی حد باقی نہیں رہی ہے جس پر یہ دائرہ ختم ہو جاتا ہو۔ لہٰذا اب یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک غیر مسلم حکومت کے تحت رہ کر مسلمان زیادہ عرصہ تک اپنی اسلامیت کو برقرار رکھ سکیں۔ طریق تعلیم، نظم معیشت اور طرز تمدن میں جو تغیرات غیر مسلم حکمران کرینگے وہ حد سے حد تیسری پُشت تک پہنچتے پہنچتے مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو خود بخود غیر مسلم بنا چھوڑینگے بغیر اسکے کہ ان کے گلوں پر تلوار رکھ کر انہیں کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے۔ اس تدریجی عملِ تحلیل سے کوئی دستوری تحفظ اور کوئی اعلانِ حقوق ہماری حفاظت نہیں کر سکتا۔

یہ تین حقیقتیں آج اس قدر نمایاں ہو چکی ہیں کہ اب ان کے خلاف دلائل پیش کرنا قوتِ استدلال کو فضول ضائع کرنیکے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اگرچہ میں برملا تحدّی کرتا ہوں کہ اگر کسی صاحب کے پاس ان کے خلاف کوئی دلیل ہے تو وہ سامنے لائیں اور ضرور لائیں، مگر میرا دوستانہ مشورہ یہی ہے کہ سورج کے عدم وجود پر دلیل لانے کی کوشش نہ کی جائے، بلکہ جو کچھ بھی گفتگو کرنی ہے، سورج کو موجود مان کر کی جائے۔

ان حقائق کو تسلیم کر لینے کے بعد جب ہم غور کرتے ہیں کہ اس حالت میں ہمارے لیے کونسی پالیسی انسب ہے، تو تین مختلف تجویزیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ نظام حکومت کا ارتقاء جس ڈھنگ پر ہو رہا ہے اُسی پر ہونے دیں، ہندوستان کی تعمیر جدید جس نقشے پر کی جا رہی ہے، اُسکی بھی مزاحمت نہ کریں، بلکہ قوم پرستوں کی سیاسی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیں، تاکہ انگریزی امپیریلزم کا خاتمہ ہو جائے۔ اگر اس کا نتیجہ یہی ہونیوالا ہے کہ ہم انگریز کے بجائے ہندو کے غلام ہو جائینگے، تب بھی ہمیں اسکو گوارا کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح دنیائے اسلام تو انگریزی اثر سے آزاد ہو جائیگی، اور مقامات مقدسہ تو انگریز کی گرفت سے چھوٹ جائینگے — اس فائدہ کو ملحوظ رکھ کر کہنے والے یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ یہ پالیسی اختیار کرنا مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے، حتّٰی کہ اگر نہ کرینگے تو گنہگار ہونگے۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ ہم کو کانگریس میں شریک ہو کر اس کے نظام کی اصلاح کرنی چاہیے کانگریس ایک جمہوری ادارہ ہے۔ ہر طبقے اور خیال کے لوگ اس میں شریک ہو سکتے ہیں اور جمہوری اصولوں پر طاقت پیدا کر کے اس کو متأثر کر سکتے ہیں۔ اس وقت جو گروہ اس پر حاوی ہو گیا ہے، اس کے حاوی ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس ادارہ میں طاقت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، اور اپنے مخالفین کو اس کا موقع دیدیا کہ کانگریسی نظام پر مسلط ہو کر ملک کی عنان سیاست اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اگر مسلمان اب بھی اس غلطی سے باز نہ آئے تو بلاشبہ وہی انجام ہوگا جس کا خطرہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ لیکن اگر وہ عقل سے کام لیں اور کانگریسی نظام میں داخل ہو کر طاقت پیدا کر لیں تو نہ صرف یہ کہ وہ اس برے انجام کو روک سکتے ہیں، بلکہ اپنی تنظیم سے کانگریس پر قابض بھی ہو سکتے ہیں۔

تیسری تجویز یہ ہے کہ ہم کانگریس کے مقابلہ میں اپنی تنظیم کریں اور لڑ کر اس بچۂ فرعون

کے نشو و نما کو روکیں جو فرعون برطانیہ کی گود میں پرورش پا رہا ہے۔

ہمیں بہ ثبات عقل و ہوش ان تینوں تجویزوں اور ان کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے۔

پہلی تجویز دو شدید غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔

اول تو یہ بالکل غلط طور پر فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندوستانی قوم پرستوں کی موجودہ جدوجہد کا مقصد آزادی کامل ہے، اور اس کا نتیجہ انگریزی امپیریلزم کا خاتمہ ہوگا۔ نمک سازی کے دور میں تو اس غلط فہمی کے لیے کچھ نہ کچھ گنجائش موجود تھی بھی، مگر آج جو شخص اس خیال کو اپنے دماغ میں جگہ دے رہا ہے اسے اپنے دماغ کا علاج کرانا چاہیے۔ خود آزادی پسند کانگریسی آج فریاد کر رہے ہیں کہ کانگریس انقلابیت سے دستوریت (Consti tu tiona lism.) کی طرف رجعت کر گئی ہے، اور آزادی کامل کے نصب العین کو بھلا کر اس نے حکومتِ خود اختیاری زیر سایۂ برطانیہ کو اپنا مقصود بنا لیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ توقع کرنا ہی سراسر غلط ہے کہ اس نام نہاد آزادی کی جنگ سے برطانوی امپیریلزم کا خاتمہ ہو جائیگا اور دنیائے اسلام انگریزوں کے پنجہ سے چھوٹ جائیگی۔

دوسرے بالفرض اگر ایسا ہونا متوقع بلکہ یقینی بھی ہو، تو میں کہتا ہوں کہ اس طریقہ سے دنیائے اسلام کو بچانا ہرگز ہمارا فرض نہیں ہے اور فرض تو درکنار مذھباً ہمارے لیے جائز تک نہیں ہے۔ جو علمائے کرام اس تجویز کو بڑے زور شور سے پیش فرماتے ہیں وہ اصل مسئلہ سے قطعاً ناواقف ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ دنیائے اسلام اور خصوصاً مقامات مقدسہ کی آزادی کے لیے ہر قسم کی قربانی دینا ہم پر لازم ہے، حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ جان اور

مال کی قربانی دینے پر تو ہم ضرور مامور ہیں، لیکن دین و اخلاق کی قربانی ہم کسی چیز کے لیے، حتّٰی کہ کعبۂ مقدس اور گنبدِ خضرا کیلیے بھی نہیں دے سکتے۔ اگر جنگ آزادی کا مآل صرف اسی قدر ہوتا کہ مسلمانوں کی جانیں اور انکی گاڑھی کمائیاں ہی اس میں قربان ہوتیں، تو بے شک ہم کہتے کہ دنیائے اسلام اور مقامات مقدسہ کی آزادی کے معاوضہ میں ہندوستان کے پورے آٹھ کروڑ مسلمانوں کی دولت اور ان سب کی جانیں بھی گراں نہیں ہیں۔ لیکن یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ یہاں جنگ آزادی جس چیز کو کہا جا رہا ہے اس میں جان و مال کا نہیں بلکہ دین و اخلاق کا زیاں ہے۔ اسکا مآل یہ ہے کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی عظیم الشان قوم رفتہ رفتہ مرتد ہو جائے، اور اسکی نسل سے مادّہ پرست دہریے پیدا ہوں جنکے عقائد اور اخلاق میں اسلامیت کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔ کونسا عالم دین یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ دنیا کی کسی چیز کے لیے یہ قربانی بھی دی جا سکتی ہے؟ کوئی مفتی صاحب مجھے بتائیں کہ اگر ایسی کوئی صورت پیش آجائے کہ میں رب کعبہ کا انکار کر کے کعبہ کو بچا سکتا ہوں تو میرا فرض کیا ہے؟ کعبہ کو بچانے کیلیے رب کعبہ کا انکار کر دوں؟ یا صاف کہدوں کہ ان دیواروں کے ساتھ جو کچھ پیش آنا ہے آئے، مگر رب کعبہ کا انکار نہیں ہو سکتا؟ اگر کسی مسلمان کو کعبہ کے سامنے کھڑا کیا جائے اور کہا جائے کہ یا تو اپنی بیٹی کو مرتد کرنے اور رقاصہ اور فاحشہ بنانے کیلیے ہمارے حوالہ کر دے ورنہ اس عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائیگی تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ کعبہ کو بچائے یا اپنی بیٹی کے دین و اخلاق کو بچائے؟ جو شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے اسکی رو سے تو کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ دین و اخلاق کی حفاظت پر کعبہ کی حفاظت مقدم ہے۔ پس جب ایک فرد مومن کا ایمان اور اسکی عفت و عصمت بھی بیت اللہ الحرام سے زیادہ قیمتی ہے، تو ایک پوری مسلم قوم اور اسکی آئندہ نسلوں کے ایمان و اخلاق

کے باب میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

اب دوسری تجویز کو لیجیے ـــ بظاہر یہ بڑی خوش آئند تجویز ہے ، اور سطحی نگاہ میں نہایت معقول نظر آتی ہے ، مگر تھوڑے سے تدبر ہی سے اس کا ضعف نمایاں ہو جاتا ہے ۔

انگلستان کا نظام حکومت جمہوری ہے ۔ پارلیمنٹ کے دروازے ہر طبقۂ خیال کے لوگوں کیلیے کھلے ہوئے ہیں ۔ لبرل ، کنزرویٹو ، لیبر ، سوشلسٹ حتیٰ کہ کمیونسٹ بھی اسکے ممبر بن سکتے ہیں ۔ ان میں سے جو جماعت بھی قوم کے سوادِ اعظم کو اپنا ہم خیال بنالے وہ حکومت انگلستان پر قابض ہو سکتی ہے ۔ لیکن بعینہٖ یہی مرتبہ آئرلینڈ کو بھی برطانیہ عظمیٰ کے جمہوری نظام میں حاصل تھا اور کبھی آئرش قوم کے نمائندوں کو اتنی بھی طاقت حاصل نہ ہو سکی کہ اپنے قومی حقوق کا تحفظ ہی کر لیتے ، حکومتِ انگلستان پر قابض ہو جانا تو در کنار ۔ آئرش قوم اپنی بہادرانہ قربانیوں ، اپنی زبردست تنظیم اور اپنے امریکن ہمدردوں کی بے حد و حساب مالی اعانتوں کے باوجود پارلیمنٹ کے اندر رہ کر انگریزی نظام سلطنت پر کوئی اثر نہ ڈال سکی ۔ آخر کار اسکو باہر سے لڑنا پڑا ، اُس نظام ہی سے اصلاً بغاوت کرنی پڑی جو اس پر مسلط تھا ، اور آج اسکو جو کچھ حاصل ہوا ہے ، اندرونی تعاون سے نہیں بلکہ بیرونی جنگ سے ہوا ہے ۔

سوال یہ ہے کہ انگلستان کی مختلف پارٹیوں کے حال اور آئرش قوم کے حال میں یہ نمایاں فرق کیوں تھا ؟ کیا یہ کوئی اتفاقی امر تھا ، یا درحقیقت کوئی اصولی فرق پایا جاتا تھا ؟ اس سوال پر جب آپ غور کرینگے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انگلستان کی مختلف پارٹیوں کے درمیان کوئی قومی امتیاز نہیں ہے ۔ کوئی پارٹی دوسری پارٹی کے مقابلہ میں امپیریلزم کا داعیہ نہیں رکھتی اسلیے جمہوری اصولوں کے تحت یہ پارٹیاں ایک دوسرے کو شکست دیکر نظام حکومت پر قبضہ

کر سکتی ہیں اور کرتی رہی ہیں۔ بخلاف اسکے آئرش قوم اور اہل برطانیہ کے درمیان قومی امتیاز تھا۔ انکے مقابلہ میں سب انگریز اپنی مختلف پارٹیوں کے باوجود ایک تھے۔ انگریزی قوم بحیثیت مجموعی، آئرش قوم پر اپنا امپیریلزم قائم رکھنے کا عزم کیے ہوئے تھی، اسلیے جمہوری اصول آئرش قوم کیلیے محض بیکار رہتے۔ انگلستان کے جمہوری نظام حکومت میں داخل ہو کر یہ قوم نہ تو اندرونی تعاون سے کوئی فائدہ حاصل کر سکی، اور نہ اندرونی مزاحمت سے۔ اس کے درد کا علاج باہر سے لڑنے کے سوا اور کچھ نہ تھا، چنانچہ جب اس نے یہ علاج کیا تب ہی اس کا درد دور ہوا۔

بعینہٖ یہی صورت حال یہاں بھی ہے۔ ہمارا معاملہ کانگریس کی سیاسی پارٹیوں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ پارٹیاں ہیں، اور ہم پارٹی نہیں بلکہ "قوم" ہیں۔ ان کے مقابلہ میں نہ قومی امتیاز ہے اور نہ امپیریلزم، بخلاف اسکے ہمارے مقابلہ میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ نیز ہمارا معاملہ ہندوستان کی دوسری قوموں سے بھی مختلف ہے۔ ہمارے مقابلہ میں جتنا سخت قومی امتیاز اور امپیریلزم کا داعیہ پایا جاتا ہے، ہندوستان کی کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں وہ اتنا سخت نہیں ہے۔ پس یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ جمہوری اصولوں پر تعاون یا داخلی مزاحمت کر کے ہم ایک ایسے نظام پر قابض ہو سکیں، یا کم از کم اسکو متاثر کر سکیں، جسکی اکثریت ہمارے خلاف قومی امتیاز اور امپیریلزم کا داعیہ رکھتی ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک دوسری اصولی بات بھی ذہن نشین کر لیجیے ــــ آپ کسی مضبوط نظام میں داخل ہو کر تعاون یا مزاحمت سے فروعی اصلاحات اور جزوی ترمیمات تو کرا سکتے ہیں، مگر اسکے اصول نہیں بدلوا سکتے۔ اصول بدلوانے کا طریقہ اندر سے نہیں بلکہ باہر سے دباؤ ڈالنا ہے

انگریزی سلطنت میں لاکھوں ہندوستانی ملازم ہیں۔ بڑے سے بڑے عہدوں پر بھی پہنچ چکے ہیں۔ مگر کیا وہ اسکی پالیسی اور اسکے اصولوں میں کوئی تغیر کرا سکے؟ ڈیڑھ صدی کے تجربہ کے بعد ہندوستانیوں کو آخر کار عدم تعاون اور سول نافرمانی کا طریقہ کیوں اختیار کرنا پڑا؟ اسی لیے کہ ایک مضبوط نظام میں داخل ہو کر، اسکے اصول تسلیم کر کے اور اسکے ڈسپلن کی گرفت قبول کر کے، اسکی پالیسی اور اسکے اصولوں کو بدلوانا ممکن نہ تھا۔

بالکل یہی صورت حال ہمارے اور کانگریس کے درمیان بھی ہے۔ ہمارے اور اسکے درمیان فروعی اختلاف نہیں بلکہ مقاصد، اصول اور پالیسی کا اختلاف ہے۔ وہ قومیتوں کو مٹا کر ہندوستان میں واحد قومیت بنانا چاہتی ہے، اور ہم قومیتوں کو برقرار رکھ کر بین الاقوامی وفاق چاہتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی آبادی کو ایک قوم فرض کر کے جمہوریت اور پارٹی گورنمنٹ کے اصول اختیار کرتی ہے، اور ہم سرے سے ان اصولوں ہی کے مخالف ہیں۔ وہ واحد قومیت بنانے کیلیے قوموں کے امتیازی وجود کو نظر انداز کرنے، اور انکی امتیازی خصوصیات کو دبانے اور مٹانے، اور طریق تعلیم، زبان، ادب اور تمدن و معاشرت کو ان اغراض کیلیے متاثر کرنے کی پالیسی اختیار کرتی ہے، اور ہم اس پالیسی کو اپنے لیے مہلک سمجھتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کانگریس کے نظام میں داخل ہو کر ہم تعاون یا مزاحمت سے اسکے مقاصد، اصول، پالیسی، سب کو بدل ڈالیں؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ یہ ممکن ہے، تو ارشاد ہو کہ آپ کس طاقت سے ایسا کر سکینگے؟ اخلاقی دباؤ اور دلائل کے زور سے ارکان کانگریس کے سواد اعظم کی ذہنیت، انکے تصورات، انکے رجحانات انکی خواہشات اور انکے قومی عزائم بدل ڈالیے گا؟ یا کانگریس میں مسلمانوں کی اتنی کثیر تعداد لے جائیے گا کہ جمہوری اصولوں پر آپکے ووٹ ہندوؤں کے ووٹوں سے بڑھ جائیں؟

داخلی مقاومت اور جدوجہد سے ... کسی منظم جماعت کے اصول اور طریقِ کار میں تغیر پیدا کرنے کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں :

یا تو تغیر چاہنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ وہ اس جماعت پر چھا جائیں۔ اس صورت میں کلی تغیر بھی ہو سکتا ہے۔

یا اس جماعت کے اندر ان کا نظام اتنا زبردست ہو کہ وہ اپنی منظم مقاومت سے اس جماعت کو پریشان کر دیں۔ اس صورت میں کلی تغیر تو نہیں، البتہ قابلِ لحاظ تغیر ضرور ممکن ہے۔

یا پھر تغیر چاہنے والے اپنے اخلاقی اثر اور اپنے دلائل کی قوت سے اس جماعت کی رائے کو متاثر کر دیں، اور اس طرح وہ جماعت خود ہی حق اور عدل کی طرف مائل ہو جائے۔ اس طریقہ کی کامیابی تمام تر اس جماعت کی انصاف پسندی و حق آگاہی پر منحصر ہے۔

ان میں سے پہلی صورت تو یہاں ناقابلِ عمل ہے۔ کسی حسابی معجزے کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کے ووٹ، ہندوؤں کے ووٹوں سے زیادہ ہو جائیں۔ لہذا جو لوگ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ کثرت سے کانگریس میں داخل ہو اور اس پر قابض ہو جاؤ انکی بات اتنی ہی قابلِ التفات ہے جتنی اس شیر خوار بچے کی بات قابلِ التفات ہو سکتی ہے جو بے چارا ایک اور چار کی نسبت سے بھی واقف نہیں۔

اب باقی دو صورتیں رہ جاتی ہیں، سو ہم ان کا تفصیلی امتحان لے کر دیکھینگے کہ ان سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

داخل میں منظم جدوجہد اور مقاومت صرف اس طرح ممکن ہے کہ کانگریس میں جتنے مسلمان شریک ہیں، اور آئندہ شریک ہوں، وہ سب کے سب، یا انکی ایک بہت بڑی اکثریت ایک پارٹی،

بلکہ ایک ٹیم بن کر رہے، اُن کی قیادت ایک ایسے دیندار گروہ کے ہاتھ میں ہو جو اسلامی مفاد کا صحیح احساس و شعور رکھتا ہو، اور وہ اس گروہ کی ایسی کامل اطاعت کریں کہ ان کا کانگریس میں رہنا یا نکل آنا اس کے حکم پر موقوف ہو۔

کیا بحالات موجودہ کانگریس میں ایک مسلم پارٹی کی تنظیم اس طرز پر ہو سکتی ہے؟ واقعات سے اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ وہاں جو مسلمان شریک ہیں، ظاہر میں ان سب پر لفظ مسلمان کا اطلاق ہوتا ہے، اور آزادیٔ ہند کے مسئلے میں وہ ہم آہنگ بھی ہیں، لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے خیالات اس قدر متضاد ہیں کہ ان کو ایک پارٹی میں منسلک کرنیکا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک گروہ تو قطعی طور پر اسلام سے منحرف ہو چکا ہے، اور حتماً یہ رائے رکھتا ہے کہ ہندوستان کے آئندہ نظام اجتماعی میں مذہب کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ دوسرا گروہ نہ منحرف ہے اور نہ معتقد۔ اس گروہ میں اتنی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں جتنی سانپوں کی اقسام ہیں۔ ان میں سے بعض اسلام کے متعلق خود اپنے کچھ تصورات رکھتے ہیں جن کے لیے کتاب و سنت کی سند غیر ضروری ہے۔ بعض کو "مسلمان" کے سیاسی و معاشی مفاد سے تو ضرور دلچسپی ہے، مگر اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض ایسے ہیں جو مسلمانوں کے مفاد کو کسی حد تک اہمیت ضرور دیتے ہیں، مگر اتنی نہیں کہ "ملک" کے مفاد کا جو تصور ان کے دماغ میں ہے اس پر مسلمانوں کے مفاد کو قربان کرنے میں انہیں کوئی تامل ہو۔ تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو دیندار، اہلِ علم اور نیک نیت ہیں۔ کانگریس میں جب کبھی ہندوستان کے مشترک مفاد کا کوئی مسئلہ اٹھے گا، یہ سب گروہ ایک آواز بلند کرینگے۔ مگر جب اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا سوال آئیگا تو یہ اسقدر بھانت بھانت کی بولیاں بولینگے کہ اسلام اور مسلمان، دونوں غیر مسلموں کیلیے مضحکہ بن کر رہ جائینگے، اور یہ متعین کرنا بھی مشکل ہو جائے گا کہ حقیقت میں اسلام کیا چیز ہے اور مسلمانوں کا مفاد کس چڑیا کا نام ہے۔

ماس کانٹیکٹ کے ذریعہ سے یہ تینوں گروہ مسلمانوں کو کانگریس میں بھرتی کر رہے ہیں، اور اب علمائے کرام کے صدقے میں کانگریس کے ہندو کارکن بھی بھرتی کا کام کرنیکے قابل ہو گئے ہیں۔ اس طرح جو مسلمان کانگریس میں جا رہے ہیں وہ تین بالکل مختلف گروہوں اور ان کی بے شمار شاخوں میں تقسیم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

کانگریس کے ہندو ارکان کی ہمدردیاں تمام تر پہلے گروہ سے وابستہ ہیں۔ خواہ گاندھی جی ہوں، یا جواہر لال، یا کوئی سخت مہا سبھائی، بہر حال فطرۃً ان سب کا میلان اُن نام نہاد مسلمانوں کی طرف ہے جو اسلام سے اعتقاداً اور عملاً منحرف ہو چکے ہیں، اور جو اسوقت ہندوستان میں اسلام اور اسلامی قومیت کی جڑیں کاٹنے کیلیے بدترین منافقوں کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ کانگریس کے ذمہ دار عہدے اور کانگریسی حکومتوں کے تحت عزت اور منفعت اور اثر و اقتدار کے مناصب تمام تر انہیں منافقین کیلیے وقف ہیں اور رہینگے۔ ان کے بعد کانگریسی لیڈروں کے نزدیک اگر کوئی گروہ قابلِ ترجیح ہے تو وہ دوسرا گروہ ہے، اور اس گروہ میں سے بھی خصوصیت کیسا تھ وہ طبقہ جو منافقین کے مقام سے اقرب ہے۔ باقی رہا تیسرا گروہ اور اس سے قریب تر تعلق رکھنے والے طبقے، تو ان کو محض آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ جب تک یہ وفادار خدام کی حیثیت سے صرف رنگروٹ بھرتی کرتے رہینگے، ان سے مداہنت برتی جائیگی۔ جہاں انہوں نے کچھ زور پکڑا اور اسلامی مفاد کا نام لیا، ان پر منافقین کی اُس فوج کو شکار دیا جائیگا جو اسی دن کے لیے پرورش کی جا رہی ہے۔ ایسے موقع پر ہندو لیڈروں کو خود سامنے آنیکی تکلیف بھی نہ اٹھانی پڑیگی۔ ہماری اپنی قوم کے منافقین ہی ہمارے دینداروں کو بھنبوڑ کھائینگے۔

کیا ایسی حالت میں کانگریس کے اندر اسلامی مفاد کیلیے کوئی منظم جد و جہد کی جا سکتی ہے؟

اسکے بعد تیسری صورت باقی رہ جاتی ہے - جہاں تک اخلاقی اثر اور دلیل وحجت کا تعلق ہے، اسکے لیے کثرتِ تعداد کی کوئی حاجت نہیں - اگر کوئی جماعت واقعی حق پسند اور نصفت شعار ہے تو اس کو ایک تنہا شخص بھی حق کا اعتراف کرنے اور انصاف سے کام لینے پر آمادہ کرسکتا ہے - اب ہم پوچھتے ہیں کہ گذشتہ چند مہینوں میں کانگریسی حکومتوں نے جو مسلمانوں کیساتھ جو صریح اور ناقابل انکار بے انصافیاں کی ہیں، ان میں سے کس کی تلافی ہمارے دیندار کانگریسی بھائیوں نے اپنے اخلاقی اثر اور اپنے زورِ استدلال سے کرالی؟ کیا واردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم میں ایک شوشے کا بھی تغیر کرالیا؟ کیا گائے کی قربانی کو دفعہ ۱۴۴ کی زد سے بچا لیا؟ کیا اس صریح بے انصافی کا کوئی تدارک کرالیا جو بہار اور سی پی کے ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں میں مسلمانوں کیساتھ روا رکھی گئی ہے؟ جگہ جگہ مدرسوں اور پبلک جلسوں میں مسلمانوں کو بندے ماترم کیلیے قیام تعظیمی پر جو مجبور کیا جارہا ہے، کیا اسکا کوئی تدارک کرالیا؟ (اور اگر یہ نہیں تو یہی ارشاد ہوکر صرف نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجتے ہی کیلیے قیام تعظیمی ممنوع ہے، اور صرف اسی پر رسالے تصنیف کرنے اور فتوے شائع کرنے کی بھی ضرورت ہے؟ باقی رہا بندے ماترم تو وہ اس سے بالاتر ہے کہ اسکے لیے قیام تعظیمی کرنے یا نہ کرنے کا سوال معرض بحث میں لایا جاسکے!) - سی پی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ہندو وزراء اور ایک مسلمان وزیر کیساتھ جو مختلف قسم کے طرزِ عمل اختیار کیے، کیا اس پر کوئی نتیجہ خیز بازپرس کرلی؟ حکومت کی طاقت سے اردو کو دبانے اور ہندی کو ابھارنے کی علی الاعلان جو کوششیں ہورہی ہیں، کیا ان کو رکوا دیا؟ کانگریسی حکومتوں میں نہایت متعصب اور بدنام مہاسبھائیوں کو جو ذمہ دار عہدے دیے گئے ہیں، کیا ان پر کوئی مؤثر احتجاج کرلیا؟ اگر کوئی کانگریسی مسلمان سخن پروری کیساتھ نہیں بلکہ دیانت اور صداقت کیساتھ ان امور کے متعلق اپنا کوئی کارنامہ پیش کرسکتا ہے، تو سامنے آئے اور ضرور آئے - اور اگر اسکے پاس ہمارے ان سوالات

کا کوئی جواب اسکے سوا نہیں ہے کہ "ہماری پشت پر وہ بندار مسلمانوں کی اتنی طاقت ہی نہیں جس سے ہم ان بے انصافیوں کا تدارک کرا سکیں"، تو ہمارا مدعا خود اسکے اپنے اعتراف سے ثابت ہو گیا۔ ہم بھی اس سے یہی اعتراف کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ایک ایسی جماعت سے تعاون کر رہا ہے جو حق کو حق اور انصاف کو انصاف ہونے کی حیثیت سے قبول کرنے والی نہیں ہے، بلکہ صرف زور اور طاقت کے آگے سر جھکانے والی ہے، لہذا اسکے ساتھ تعاون کر کے محض اخلاقی طاقت سے وہ کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

درحقیقت ہر دلیل سے یہ بات ثابت کی جاسکتی ہے کہ کانگریسی ہندوؤں کے اندر امپیریلزم کی روح کار فرما ہے، اور اس میں اور انگریز میں اسکے سوا کوئی فرق نہیں کہ انگریز کا امپیریلزم ہم پر مستولی ہو چکا ہے، اور ہندو کا امپیریلزم انگریز کی مدد سے مستولی ہو رہا ہے۔ پس انگریزی امپیریلزم کیساتھ تعاون کرنا اگر ٹوڈیت ہے، تو ہندو امپیریلزم کیساتھ تعاون کرنا بھی ٹوڈیت ہے۔ مسلمان کے نقطۂ نظر سے دونوں میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ ایک قیصر کا غلام ہے اور دوسرا ابوجہل کا۔

معذرت

جب سے "ترجمان القرآن" دارالاسلام منتقل ہوا ہے، پٹھانکوٹ پوسٹ آفس کا اسٹاف اسکو نقصان پہنچانے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کا تازہ کارنامہ یہ ہے کہ ربیع الاول کا پرچہ بلا کسی قانونی بنیاد کے بیرنگ کر دیا گیا۔ ہم اس کے تدارک کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ مگر جب تک ہمیں اس میں کامیابی ہو، ناظرین رسالہ سے گذارش ہے کہ دوسروں کے ظلم کا الزام ہمارے سر رکھ کر شکایت نہ فرمائیں، بلکہ اس ظلم کے دفع کرنے میں ہماری مدد کریں۔

(مینجر)

مقالات

اختلافی مسائل اور ان کا نقطۂ عدل

از افادات حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

(ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ)

اسلام وحدت کا پیام لیکر آیا تھا مگر اس وقت جہل و تعصب کے ہاتھوں میں پڑ کر وہ اختلاف و نزاع کی خدمت سر انجام دے رہا ہے۔ مذہب کے چند جزئی مسائل نے باہمی ہنگامہ آرائیوں کا جو طوفانِ عظیم بپا کر رکھا ہے، انکی حقیقت پر جب میں نے پوری طرح غور کیا تو یہ پایا کہ ہر گروہ حق و اعتدال کے مرکز سے کچھ نہ کچھ ہٹا ہوا ہے اور بیجا تعصب اور غلو سے کام لے رہا ہے۔ ہر ایک اتباعِ حق کا مدعی ہے، اگر سچائی کی اخلاص طلب شاہراہ پر چلنے کے بجائے جذبات کی لہروں میں بہہ رہا ہے۔ مجھے رحمت الٰہی کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ اس نے مجھے عدل کی میزان بھی بخش دی ہے جس پر حق اور باطل کو تول کر میں اندازہ کر رہا ہوں کہ حق کی سیدھی اور صاف راہ کون سی ہے، اور وہ اس وقت کسطرح اختلافات کی خارزار بن گئی ہے، اور ان نزاعات و اختلافات کی بنیاد کیا ہے۔

اہلِ زمانہ کی اس افسوسناک حالت کو دیکھکر ضروری معلوم ہوا کہ اُن مسائل کی اصل نوعیت انہیں سمجھا دی جائے جنکے اندر ان کے افکار اُلجھ کر رہ گئے ہیں، اور جنکی تائید و تردید میں ان کے قلم بغیر کسی سچی بصیرت کے بیجا جوش و خروش کا اظہار کر رہے ہیں۔

ان میں سے سب سے اہم مسئلہ تقلید کا ہے۔ ائمہ اربعہ کی تقلید کا جواز قریب قریب ساری اُمت

کا اجماعی مسئلہ ہے، اور اس کے اندر جو مصالح ہیں انہیں ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے، خصوصاً اس پُر آشوب زمانہ میں جبکہ عام قوائے فکریہ پر جمود اور روں ہمتی کی موت سی طاری ہے، دلوں میں طلبِ حق کا کوئی جوش اور ولولہ باقی نہیں، شریعت کے قوانین انسانی آرار پر قربان کیے جارہے ہیں، اور ہر کس و ناکس خود پرستی اور خود رائی کے نشہ میں چور ہے۔

تقلید کے بارے میں ابنِ حزم کے اس قول نے کہ "آیات قرآنی اور اجماع سلف کی رو سے تقلید حرام ہے اور خود ائمہ مجتہدین نے اپنی تقلید سے منع فرمایا ہے"، لوگوں کو عجیب غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے اور ہر عامی و جاہل پر اس کا اطلاق ہوتا ہے حالانکہ یہ قول بجائے خود بالکل برحق ہے، اپنا ایک خاص محل اور معنی رکھتا ہے اور اس کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے:

(۱) جو اپنے اندر اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہو، خواہ ایک ہی مسئلہ میں سہی۔

(۲) جو اچھی طرح جانتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں بات کا حکم دیا ہے، یا فلاں بات سے روکا ہے، اور یہ حکم منسوخ نہیں ہے۔ اس بات کا علم خواہ اُسے احادیث کے تتبع اور مخالف و موافق دلائل کے استقرار سے حاصل ہوا یا یہ دیکھکر کہ ارباب علم و بصیرت کا سوادِ اعظم اس طرف جارہا ہے اور مخالف کے پاس قیاس آرائیوں اور منطقی دقیقہ سنجیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، وہ اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ ایسی صورت میں حدیثِ نبوی کی مخالفت کا سبب یا تو کھلا ہوا حمق ہو سکتا ہے یا کوئی چھپا ہوا نفاق۔

شیخ عزالدین عبدالسلام اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حیرت ہوتی ہے ان تقلید پرست فقہار پر جو اپنے امام کی اجتہادی غلطی سے واقف ہونیکے بعد اِس کے قول پر سختی سے جمے رہتے ہیں اور اسے ترک کر کے کسی ایسے

قول کو اختیار نہیں کرتے جو اپنی صحت پر کتاب و سنت اور قیاس صحیح کے بے شمار شواہد رکھتا ہو۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ نادان اس اندھی تقلید کے اندھے جوش میں عملاً ظواہر کتاب و سنت کی بھی مخالفت پر تل جاتے ہیں اور اپنے امام کی اصابت رائے بلکہ "معصومیت" ثابت کرنے کیلئے نصوص شرعیہ کی ایسی رکیک، مہمل اور فاسد تاویلیں کرتے ہیں کہ ان سے بڑھکر تحریف کلام کی مکروہ اور حیرت انگیز مثال شاید ہی مل سکے"

پھر ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"صدر اول میں جس سے بڑھکر مبارک اور حق شناس دور شاید قیامت تک نہ آئے، لوگوں کا حال یہ تھا کہ جس عالم دین کو پا جاتے اسی سے فتوی پوچھ لیا کرتے تھے، بغیر اس تحقیق اور تجسس کے کہ یہ عالم کس خیال اور مسلک کا پیرو ہے۔ لیکن اس دور کے بعد حالت میں ایک عظیم الشان فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ چار مذاہب اور ان کے جامد مقلدین کا ظہور ہوتا ہے اور ہدایت کے اصل مرکز سے بالکل بے پروا ہو کر صرف ائمہ کے اقوال پر اعتماد کر لیا جاتا ہے خواہ ان کا کوئی قول کتنا ہی کمزور اور بے دلیل و حجت ہو۔ گویا مجتہد، مجتہد نہ رہا، اللہ کا رسول بنا لیا گیا، جو خود معصوم ہے اور اسکی ہر بات وحی الہٰی ہے۔ یہ راستہ حق کا راستہ نہیں ہے بلکہ سراسر جہل اور باطل کا راستہ ہے"

امام ابو شامہ کا فیصلہ بھی سننے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:

"جو شخص فقہ سے دلچسپی رکھتا ہو اُسے چاہیے کہ کسی ایک ہی امام کے مذہب پر اکتفا نہ کرے بلکہ ہر مجتہد کے اقوال پر نظر ڈالے۔ تمام کے اندر ڈوب کر حق کا سراغ لگائے اور اس غواصی میں اسے جو قول قرآن و سنت سے زیادہ اقرب ملے اسی کو

اختیار کرے - اگر علوم اوائل کے ضروری حصوں پر اس کی نگاہ ہوگی تو انشاء اللہ یہ قوت تمیز اسے بآسانی حاصل ہو جائیگی، اور کسی دقت اور ناکامی سے دوچار ہوئے بغیر وہ شریعت کی اصل شاہراہ پالے گا - ایسے شخص کو چاہیے کہ تعصب کے مہلک جراثیم سے اپنے دماغ کو پاک رکھے اور اختلاف و نزاع کی اُن پر خطر وادیوں میں ہرگز قدم نہ رکھے جسے متاخرین نے تیار کر رکھا ہے، کیونکہ وہاں تضیع اوقات اور انتشار طبع کے ماسوا کچھ نہیں مل سکتا - امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے خود اپنی اور ہر دوسرے امام کی تقلید سے منع فرمایا ہے جسکا ذکر مزنی نے اپنی کتاب میں بہت تفصیل سے کیا ہے۔"

(۳) ابن حزم کا فتویٰ اس شخص پر بھی متحقق ہوتا ہے جو عامی اور علم دین سے بے بہرہ ہونے کی بنا پر تقلید کرنے میں تو حق بجانب ہو، مگر وہ کسی خاص امام کی تقلید اس اعتقاد کے ساتھ کرتا ہو کہ اس سے خطا کا ارتکاب غیر ممکن ہے، اور اس کا امام جو کچھ کہتا ہے وہ حق ہی ہوتا ہے - نیز اس اعتقاد کے ساتھ وہ اپنی جگہ یہ فیصلہ بھی کرلے کہ اس خاص امام کی تقلید پر وہ ہر حال میں قائم رہیگا، خواہ کسی مسئلہ میں اس کے قول کا خلافِ قرآن و حدیث ہونا ثابت ہی کیوں نہ ہو جائے - یہی وہ یہودیت ہے جس نے بنی اسرائیل کی توحید کو بالکل شرک سے بدل دیا تھا جیسا کہ امام ترمذی نے عدی ابنِ حاتم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ :

"آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیۃ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ پڑھکر فرمایا کہ یہود اپنے احبار (علماء) اور رہبان (مشائخ) کی عبادت تو نہیں کرتے تھے، مگر ان کا حال یہ تھا کہ جس چیز کو ان کے علماء اور مشائخ حلال کہہ دیتے اسے وہ (بغیر کسی شرعی دلیل کے) حلال مان لیتے تھے اور جس شے

کو وہ حرام قرار دیتے تھے اسے وہ حرام سمجھ لیتے تھے۔"

پس کسی امام کی تقلید اس اعتقاد کے ساتھ کرنا کہ اس کی زبان عین شریعت کی زبان ہے یقیناً غیر اللہ کی پرستش ہے۔

(۴) جو شخص اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ ایک حنفی کسی شافعی فقیہ، یا شافعی، کسی حنفی فقیہ سے فتویٰ پوچھے یا اس کے پیچھے نماز پڑھے، وہ بھی ابن حزم کے فتوے کی زد میں آجاتا ہے، اس لیے کہ یہ اجماع سلف اور صحابہ و تابعین کرام کے عمل کی کھلی ہوئی مخالفت ہے جو کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے ابن حزم کے قول کا منشا۔ ان قیود اور شرائط کو ملحوظ رکھ کر اس کا اطلاق کیا جائیگا اور جہاں صورت حال یہ نہ ہو وہاں تک اس کا دائرہ وسیع نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک شخص ہے جو محض اقوالِ رسولؐ ہی کو دین سمجھتا ہے، صرف اسی چیز کی حلت کا اعتقاد رکھتا ہے جسے اللہ اور اسکے رسول نے حلال کیا ہو، اور صرف اسی شئے کو حرام سمجھتا ہے جسے اللہ اور رسول نے حرام قرار دیا ہو، یعنی تحریم و تحلیل کا حق وہ ایک لمحہ کیلیے بھی کسی اور کو نہیں دیتا، لیکن اس ایمان اور اعتقاد کے باوجود چونکہ وہ اقوالِ رسولؐ پر وسیع نظر نہیں رکھتا، نہ متعارض نصوص کو تطبیق دینے کی قدرت رکھتا ہے، اور نہ نصوص شرعیہ سے احکام کا استنباط کر سکتا ہے، اس لیے اگر وہ ایک ایسے ثقہ اور صحیح النظر عالم دین کا اتباع کرتا ہے جو اس کے نزدیک سنت رسول کے مطابق فتویٰ دینے والا ہے، اور یہ اتباع بھی وہ اس نظریہ کے ساتھ کرتا ہے کہ جب کبھی کوئی نص شرعی اسکے خلاف ملے گی تو بغیر کسی تعصب اور اصرار کے وہ اس قول کو ترک کر دے گا، تو پھر نہیں معلوم کہ کوئی شخص کیونکر ایسی تقلید یا اتباع کو ناجائز کہہ سکتا ہے، جب کہ عہد نبوی سے لے کر اب تک تمام مسلمانوں میں افتاء اور استفتاء کی یہی سنت متواترہ چلی آرہی ہے۔ اب خواہ کوئی

انسان کسی ایک ہی فقیہ سے ہمیشہ فتویٰ پوچھا کرتا ہو، یا کبھی ایک فقیہ سے اور کبھی دوسرے سے، دونوں فعل جائز ہیں، بشرطیکہ مستفتی، فقیہ اور رسول کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔

پس ہماری تقلید پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے جبکہ ہم کسی امام کے متعلق یہ ایمان نہیں رکھتے کہ وہ معصوم ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پر علم فقہ کی وحی نازل فرمائی ہے اور اسکی اطاعت ہم پر فرض کر دی ہے۔ ہم تو اگر کسی امام کا اتباع کرتے ہیں تو یہ جان کر کرتے ہیں کہ وہ کتاب و سنت کا عالم اور روح شریعت کا مزاج شناس ہے، اس لیے اس کا قول یا تو آیات و احادیث کے صریح دلائل پر مبنی ہے، یا ان سے ماخوذ اور مستنبط ہے۔ یا پھر قرائن سے اس نے یہ بات تحقیق کر لی ہے کہ یہ حکم فلاں علت کی بنا پر ہے اور جب اسے اپنی فہم کی صحت پر پورا اطمینان ہو گیا ہے تب ہی اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کر کے فتویٰ دیا ہے، گویا وہ دراصل زبان حال سے اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے کہ میرے خیال میں شارع علیہ السلام نے ایسا فرمایا ہے کہ جہاں کہیں یہ علت پائی جائیگی وہاں یہی حکم جاری ہوگا اور ایسے تمام قیاسی احکام اسی عموم میں داخل ہونگے، یا بالفاظ دیگر یہ اقوال بھی شارع علیہ السلام کی طرف منسوب شمار کیے جائینگے اگرچہ انکی قطعیت یقینی اور شکوک سے بالکل پاک نہیں کہی جا سکتی۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو کوئی مسلم کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا۔ پس اگر رسولؐ معصوم ــــ کہ صرف آپ ہی کی اطاعت اللہ نے ہم پر فرض کی ہے ــــ سے ہمیں کوئی ایسی صحیح روایت مل جائے جو قولِ امام کی مخالفت کرتی ہو، اور پھر بھی ہم اس کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے نص قطعی کو چھوڑ کر ظن انسانی کی تقلید پر جمے رہیں، تو ہم سے بڑھکر شقی اور نامراد کون ہوگا، اور کل خدائے قہار کے سامنے ہم کیا جواب دینگے؟

جائز تقلید کی صحیح تصویر یہی ہے جو ان چند لفظوں میں کھینچی گئی ہے۔ اگر امت مسلمہ غلو سے

اپنے قوائے فکریہ کو آزاد کرے اور اپنی آنکھوں پر سے تعصب کے پردے ہٹا کر اصل تصویر دیکھنے لگے تو بہت سی لفظی نزاعیں ختم ہو جائیں اور مذہبی اختلافات کی شورانگیز فضا کسی قدر امن و سکون کی خوشگواریوں سے بدل جائے۔

مسئلۂ تقلید کے بعد دوسرا اہم مسئلہ استخراج مسائل کا ہے، جسکے دو اصول ہیں:
ایک تو یہ کہ الفاظِ حدیث کا تتبع کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ فقہاء کے اصول کو سامنے رکھکر مسائل کا استنباط کیا جائے۔ شرعاً ان دونوں اصلوں کی اہمیت مسلم ہے۔ ہر دور کے فقہائے محققین کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ ان دونوں اصلوں کا لحاظ رکھتے تھے۔ کوئی ایک کی رعایت زیادہ کرتا کوئی دوسرے کی۔ لیکن ایسا کبھی نہ کرتے کہ کسی اصل کو بالکلیہ ترک کر دیں۔ پس کسی جویائے حق کیلیے سزاوار نہیں ہے کہ وہ بالکل ایک ہی طرف جھک جائے جیسا کہ آج دونوں فریق کا عام شیوہ ہے۔ اور یقین کرو کہ ان کا یہی "شیوہ" انکی ساری ضلالتوں کا ذمہ دار ہے۔ ان دونوں اصلوں کو الگ الگ کر کے ہدایت کی سیدھی راہ پانا بہت مشکل ہے۔ حق کا راستہ یہ ہے کہ ان میں تفریق کرنیکے بجائے دونوں میں مطابقت پیدا کی جائے، اور ایک سے دوسرے کی عمارت ڈھانے کے بجائے اُسکے کمزور مقامات کی اصلاح اور تشئید کا کام لیا جائے۔ اس طرح احکام دین کا جو قصر تعمیر ہوگا، نہایت مستحکم اور حق کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوگا، اور اس میں باطل کے راہ پانے کی کوشش قریب قریب بیکار ثابت ہو گی۔ اسی محتاط اور حکیمانہ نکتہ کی طرف امام حسن بصریؒ ہماری رہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

سنتکم والله الذی لا اله — اُس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں،
الا ھو بینہما بین الغالی والجافی — کہ تمہارا راستہ حد سے بڑھنے والے اور حد تک (بوجہ سہل انگاری کے) نہ پہنچنے والے دونوں کے بیچ میں ہے۔

یعنی حق کا مرکز افراط و تفریط کے بیچ میں ہے۔ جو اہل حدیث ہیں انھیں چاہیے کہ اپنے اختیار کردہ مسلک کو مجتہدین سلف کی رایوں پر پیش کر لیا کریں۔ اسی طرح جو اہلِ تخریج ہیں اور مجتہدین کے اصول پر مسائل کا استنباط کیا کرتے ہیں، انھیں بھی چاہیے کہ حتی الوسع صحیح اور صریح نصوص کو اپنے اصول اور رائے پر قربان نہ کریں، اور نہ ایسا طریقہ اختیار کریں کہ فرمودۂ نبوی کی صریح مخالفت کا انھیں بار اٹھانا پڑے۔

کسی محدث کیلیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ان اصول حدیث کے اتباع میں بے جا تعمق اور توغل سے کام لے جنہیں پرانے محدثین نے وضع کیا ہے، کیونکہ بہر حال وہ بھی انسان ہی تھے، فکر و نظر کی لغزشوں سے ان کے بنائے ہوئے قواعد محفوظ نہیں کہے جا سکتے، اور نہ شارع کی طرف سے انکی صحت اور قطعیت پر کوئی سند پیش کی جا سکتی ہے۔ اس اصول پرستی کے تشدد آمیز رویہ سے بسا اوقات حدیث، اور قیاسِ صحیح، دونوں کو رد کر دینا پڑتا ہے مثلاً انقطاع یا ارسال کے ایک ذرا سے شک کی بنا پر کتنی ہی حدیثیں متروک اور نا قابلِ استناد ٹھیرا دی جاتی ہیں، حالانکہ فی نفسہٖ وہ قولِ رسول ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ ابنِ حزم نے اسی طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے تحریم معازف (باجوں کو حرام قرار دینے) والی حدیث کو نا قابل حجت قرار دے دیا، صرف اس وجہ سے کہ امام بخاری کی روایت میں انقطاع کا شبہ پایا جاتا ہے، حالانکہ حدیث فی نفسہٖ صحیح اور اس کا سلسلۂ اسناد متصل ہے۔ ہاں اگر کسی قوی نص سے تعارض ہو تو البتہ انقطاع کے شبہ کی بنا پر اُسے مرجوح قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن حدیث کو سرے سے متروک ٹھیرا دینا یقیناً زیادتی ہے۔

اسی طرح ارباب حدیث کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی محدث کی روایتوں کو عموماً زیادہ صحت کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے اور دوسرا ظاہری صحت کی حفاظت سے اتنا اعتناء نہیں کرتا، تو کلیۃً پہلے شخص کی ہر روایت (جو اس محدث سے کی گئی ہو) دوسرے راوی کی روایت پر مقدم

اور مرجح مانی جائیگی، خواہ اس دوسرے راوی کے اندر ترجیح اور برتری کے کتنے ہی واضح دواعی کیوں نہ موجود ہوں۔ لوگوں کی یہ ظاہر پرستی سخت تنقید کے قابل ہے۔ کون نہیں جانتا کہ عام رواۃ، حدیثوں کو بالمعنیٰ بیان کیا کرتے تھے، الفاظ و حروف کے محفوظ رکھنے کا چنداں رواج نہ تھا۔ پس ادبی تصانیف میں جس طرح اہل ادب و بلاغت ایک ایک حرف کے تقدم و تاخر اور اسکی وضع و ترتیب سے نکتہ آفرینیاں کیا کرتے ہیں، ویسا ہی تعمق متن حدیث میں برتنا، حتیٰ کہ ایک کلمہ کی تقدیم یا تاخیر، الفاظ کی نشست اور فَا اور وَاو جیسے حروف کے دقیق معنوی خصائص سے استدلال کا رُخ متعین کرنا، جبکہ عام روایتیں بالمعنی بیان کی گئی ہیں، ایک طرح کی لغویت اور الفاظ کی ناروا غلامی ہے۔ ورنہ تم دیکھتے ہو کہ ایک ہی روایت میں ایک روای ایک لفظ استعمال کرتا ہے اور بعینہٖ اُسی روایت میں اُسی سند کے ساتھ دوسرا راوی ایک دوسرے ہی لفظ کے ذریعہ حدیث کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

متن احادیث کے بارے میں صحیح مسلک یہی ہونا چاہیے کہ راوی جو کچھ بھی اپنی زبان سے کہے اسے کلام نبوی کی حیثیت سے مان لیا جائے۔ ہاں اگر کوئی اور قوی حدیث یا شرعی دلیل اس کے خلاف مل جائے تو مقدم الذکر کو ترک کر کے اسے اختیار کرنا ضروری ہے۔

ایسی ہی ذمہ داری اور احتیاط اُن فقہا پر بھی عائد ہوتی ہے جو ائمۂ مجتہدین کے اصول اور فتاوی کو سامنے رکھکر مسائل کا استخراج کرتے ہیں۔ ان کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ دنیا جہان کے سارے مسائل کا حل اُنھیں اصولوں میں تلاش کیا کریں، اور اُن میں سے کُرید کُرید کر ایسے اقوال نکالیں جن سے نہ تو خود ان کے ائمہ کے اصول اور انکی تصریحات سے کوئی دور کا تعلق ہو، نہ علمائے لغت ان سے یہ معانی سمجھ سکیں، اور نہ عرفِ عام میں ایسا طریقۂ سخن فہمی رائج ہو، بلکہ محض اپنے ذہن سے ایک علت متعین کر لی جائے، یا ایک ادنی مشابہت تلاش کر لی جائے

اور اُسے قولِ مجتہد مان کر صدہا مسائل میں اس خود آفریدہ علت یا مشابہت کو معیار حکم ٹھیرا دیا جائے۔ ستم پر ستم یہ ہے کہ ان تمام تدقیقات کو نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ امام کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے، حالانکہ اگر وہ امام جسکے قول سے یہ تصریحات کی گئی ہیں، آج زندہ ہو کر آجائے اور یہ مسائل براہِ راست اُس سے پوچھے جائیں، تو باوجود اپنی تمام فہم و بصیرت اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کے، ان بلند دقائق تک اس کا تخیل پرواز نہ کر سکے گا، جنھیں اس کے پیچھے چلنے والوں نے اسی کے اقوال سے مستنبط کر رکھا ہے۔

تخریج کا یہ طریقہ نہایت غیر ذمہ دارانہ ہے۔ تخریج تو محض اس وجہ سے جائز ہے کہ وہ درحقیقت مجتہد کی تقلید اور پیروی ہے، نہ کہ اس کی غلط ترجمانی اور اس کے اشارات پر بیجا حاشیہ آرائی۔ اور وہیں تک اس کا تحقق ہو سکتا ہے جہاں تک امام کے اقوال عام اصولِ فہم و تدبر کے مطابق اجازت دے سکیں، ورنہ اگر قائل کے کلام کا رُخ کسی طرف ہو اور اس کا ترجمان و مفسر کوئی اور رخ متعین کرے تو یہ تفسیر اور ترجمانی یا مقلدانہ تخریج نہ ہو گی بلکہ کوئی اور ہی چیز ہو گی۔

اس کے علاوہ ایسے فقہاء کو اس بات کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے اصول کی پیروی کے جوش میں ایسی مستند احادیث یا آثار کو نہ رد کر دیا کریں جنھیں عام امت میں مقبولیت حاصل ہو چکی ہو۔ مثال کے طور پر حدیث مصرّاۃ کو لو، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"جو شخص ایسی بکری خریدتا ہے جسکا دودھ تھن میں پہلے سے روک لیا گیا تھا (تاکہ خریدار دھوکہ میں آکر زیادہ دام لگا دے) تو اسے تین روز تک اختیار رہتا ہے، خواہ بکری رکھ لے یا ایک صاع گندم کے ساتھ واپس کر دے"

یہ حدیث متعدد طرق سے ثابت ہے اور ثقات نے اسکی روایت کی ہے، لیکن احناف نے چونکہ یہ اصول وضع کر رکھا ہے کہ اگر راوی غیر فقیہ ہو اور اسکی روایت عام اصول کے مخالف ہو، اور کوئی عام قاعدہ نہ بنا سکتی ہو، تو سرے سے وہ حدیث متروک العمل ہوگی، اس لیے باوجود صحیح اور مستند ہونیکے یہ حدیث ان کے نزدیک متروک العمل ہے، کیونکہ وہ کوئی عام قانون نہیں بن سکتی اور راوی غیر فقیہ ہے۔

یہ طریقہ اربابِ حق کا طریقہ نہ ہونا چاہیے۔ اس میں شریعت پر ایک طرح کی جسارت پائی جاتی ہے۔ فرمانِ رسالت کا احترام بہرحال انسانوں کے بنائے ہوئے اصول و قواعد کی رعایت سے بالاتر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی غلط روی سے بچانے کیلیے فرمایا ہے:

> "جب میں کسی مسئلہ میں کوئی رائے دوں یا کوئی اصول مقرر کروں پھر رسول اللہ صلعم کا کوئی فرمان اس کے خلاف مل جائے تو میری رائے کالعدم سمجھو رسول اللہ کا فرمانا ہی اصل اصول ہے، بقیہ سب ہیچ"

(باقی)

اسماء الحسنیٰ

از افادات علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ تعالیٰ

(ترجمہ مولوی محمد عثمان صاحب فارقلیط)

ذیل میں علامہ حافظ ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ کے ایک علمی مضمون کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جس میں نہایت جامعیت کیساتھ اسمار الٰہیہ اور صفات باری کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے اور ان غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے جنکے سہارے کسی زمانہ میں تشبیہ و تعطیل کے فتنوں نے سر اٹھایا تھا اور جن میں بعض متکلمین کو بھی ٹھوکریں لگی ہیں۔ اس مضمون کو سمجھ لینے کے بعد قرآن حکیم کی اُن پرحکمت آیات کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے جن میں نہایت خوبصورتی اور کمال ترتیب کے ساتھ اسمار الٰہیہ موتیوں کی طرح پرو دیے گئے ہیں۔ (فارقلیط)

اسمار باری تعالیٰ کے سلسلہ میں چند حقیقتوں کو سمجھ لینا چاہیے کیونکہ انکے بغیر ذات و صفات باری کا صحیح تصور انسان کیلیے محال ہے۔

(۱) جو الفاظ صرف خدا کے وجود پر دلالت کرتے ہیں اور جن سے صرف خدا کی ہستی کا پتہ چلتا ہے وہ اسمار حسنیٰ اور صفات علیا کی فہرست میں داخل نہیں ہیں، کیونکہ اس قسم کے الفاظ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہے، یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیسا ہے۔ مثلاً الفاظ شَے، موجود، قدیم وغیرہ صرف خدا کے وجود پر دلالت کرتے ہیں اس لیے ان کا شمار اسمار الحسنیٰ میں نہیں ہو سکتا۔

(۲) جس صفت میں کمال کیساتھ نقص کا بھی احتمال ہو اسکو علی الاطلاق خدا کیلیے استعمال کرنا جائز نہیں۔ اسکو اس طرح استعمال کرنا چاہیے کہ اسکے مفہوم میں سے کمال باقی رہے اور نقص زائل ہو جائے۔ مثلاً مُرید، فاعل، صانع وغیرہ صفاتی نام نقائص سے خالی نہیں ہیں اسلیے علی الاطلاق خدا کیلیے انکا استعمال بھی جائز نہیں ہے۔ ہاں ہم خدا کو فعالٌ لما یرید کہینگے کیونکہ اس ترکیب سے وہ نقص زائل ہو گیا ہے جو فاعل اور مرید میں موجود ہے۔ خود باری تعالیٰ نے بھی اپنے متعلق فعال لما یرید ہی فرمایا ہے۔

(۳) کتاب الٰہی میں جو الفاظ اِخبار و اظہار کیلیے کسی قید اور شرط کے ساتھ آئے ہیں ان سے علی الاطلاق اسمار الٰہیہ مشتق نہیں کیے جا سکتے۔ لبعض متاخرین نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا اور الفاظ، فاتن، ماکر، مُضِل کو اسمار الحسنیٰ میں داخل کر لیا مگر قرآن کریم نے ان کو قید و شرط کے ساتھ استعمال کیا ہے، اسلیے ہمیں بھی اس قاعدہ کی رعایت کرنی چاہیے۔

(۴) اسمار حسنیٰ اَعلام بھی ہیں اور اوصاف بھی کیونکہ باری تعالیٰ کے اوصاف، عَلَمیت کے منافی نہیں ہیں۔ جو اوصاف اپنے موصوف کے افراد میں مشترک ہوتے ہیں وہ تو کسی ایک فرد کے لیے عَلَم نہیں بن سکتے کیونکہ اشتراک، عَلَمیت کی خصوصیت کو باطل کر دیتا ہے اسی لیے بندوں کے اوصاف، عَلَمیت کے منافی ہیں۔ مثلاً رحیم یا کریم کسی انسان کا علم نہیں ہو سکتا۔ مگر خدا کے اوصاف صرف اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور افراد میں انکا اشتراک محال ہے، اسلیے رحیم، کریم وغیرہ جس طرح خدا کے اوصاف ہیں اُسی طرح یہ اس کے اعلام بھی ہیں۔

(۵) خدائے تعالیٰ پر جس نام کا اطلاق ہوتا ہے اس سے مصدر اور فعل کا اشتقاق جائز ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اس مصدر اور فعل کو خدا کیلیے استعمال کیا جائے۔ مثلاً سمیع، بصیر اور قدیر خدا کے نام ہیں۔ اس صورت میں انکے مصادر یعنی سمع، بصر، اور قدرت کا اطلاق

بھی خدا پر جائز ہے اور انکے افعال کا استعمال بھی خدا کیلیے روا ہے - چنانچہ قرآن کریم میں ان افعال کا استعمال خدا کیلیے کیا گیا ہے مثلاً فرمایا قَدْ سَمِعَ اللهُ - وَقَدَّرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُوْنَ مگر اس استعمال کیلیے ایک شرط بھی ہے، وہ یہ کہ فعل متعدی ہونا چاہیے - فعل لازم کا اسم اور مصدر تو خدا کے حق میں استعمال ہو سکے گا جیسے حی (زندہ) اور حیات، مگر اسکا فعل استعمال نہیں ہو سکیگا جیسے حیی (بصیغہ ماضی) یعنی ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ خدا زندہ ہے مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ زندہ ہوا۔

(۶) یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال کا سرچشمہ اسکے اسمار اور صفات ہیں - چونکہ باری تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں کامل ہے اور یہ کمال اسکو ہمیشہ سے حاصل ہے اسیلیے اس کے افعال کا صدور اسکے کمال سے ہوتا ہے - لیکن مخلوقات کا معاملہ اسکا بالکل عکس ہے، یعنی ان کے اسمار کا سرچشمہ انکے افعال ہیں اور انکو جو کچھ کمال حاصل ہوتا ہے اپنے افعال سے ہوتا ہے - پس باری تعالیٰ کے افعال اسکے کمال کا مظہر ہیں اور مخلوقات کا کمال (انکی حیثیت کے مطابق) ان کے افعال کا نتیجہ ہے۔

(۷) اسمار حسنیٰ کا علم اور انکی معرفت، علم اور معلومات کی اصل ہے - معلومات کا تعلق خواہ عالم خلق سے ہو یا عالم امر سے، اور انکا علم خواہ تکوینی ہو یا تشریعی، ان سب کی اصل اسمار حسنیٰ ہیں - اسی لیے ان میں حسن و کمال ہے، رافت و رحمت ہے اور وہ بندوں کے مصالح کا خزانہ ہیں - اسی بنا پر باری تعالیٰ بندوں کو حسن و احسان کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں سے روکتا ہے تاکہ وہ اپنی تکمیل کر سکیں اور اس طریقہ سے باری تعالیٰ کے احسان کا ظہور ہو - اس سے ثابت ہوا کہ اسکے تمام اوامر علین حکمت اور مصلحت ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اسکی مخلوق میں نہ تو تفاوت اور اختلاف ہے اور نہ وہ عبث اور بیکار پیدا کی گئی ہے - اور چونکہ تمام مخلوقات کا ظہور اس کی ایجاد و تخلیق سے ہوا ہے اسیلیے خالق کی ذات اور صفات کا علم تمام علوم اور کمالات کی اصل ہے

اور جس نے اسمار الٰہی کا علم حاصل کیا اسکو جملہ معلومات کی معرفت حاصل ہو گئی۔

(۸) اللہ تعالیٰ کے تمام اسمار، اسمار حسنیٰ ہیں۔ ان میں ایک نام بھی ایسا نہیں جو حسن و کمال سے خالی ہو۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بہت سے اسمار کا اطلاق افعال کی صورت میں ہوتا ہے مثلاً خالق، رازق، محی، ممیت۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسکے جملہ افعال خیر ہی خیر ہیں اور ان میں شر اور برائی کا شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔ اگر باری تعالیٰ کے کسی فعل میں شر ہوتا تو شر سے بھی اسکا کوئی نام ضرور مشتق ہوتا جسکے بعد اسکے اسمار حسنیٰ، اسمار حسنیٰ نہ رہتے۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ شر خدا کی طرف منسوب نہیں ہوتا، کیونکہ شر جس طرح اسکی ذات میں داخل نہیں ہے اسی طرح اسکی صفات اور افعال میں بھی داخل نہیں ہے۔ شر خدا کی طرف فعل اور وصف کے اعتبار سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، بلکہ وہ محض خدا کے مفعولات اور مخلوقات میں داخل ہے۔ فعل اور مفعول میں جو فرق ہے وہ بالکل ظاہر و باہر ہے۔

شر کے مسئلہ میں تمکو غور و تامل سے کام لینا چاہیے کیونکہ اکثر متکلمین نے اس میں ٹھوکریں کھائی ہیں اور حقیقت کے عدم ادراک سے بہت سے دماغ گمراہ ہو گئے ہیں مگر اللہ تعالیٰ اہل حق کو اختلاف کے وقت ہدایت فرما دیتا ہے اور اسکی دستگیری سے وہ ضلالت سے بچ جاتے ہیں۔

(۹) حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس شخص نے اسمار حسنیٰ کا شمار کیا وہ جنت میں داخل ہوا۔ درحقیقت اسمار الٰہی کا شمار سعادت کا قطب اور نجاۃ و فلاح کا منارہ ہے۔ مگر اسکے چند مراتب ہیں۔ اوّل اسمار حسنیٰ کے الفاظ کا شمار۔ دوّم انکے معانی و مدلول کا ادراک۔ سوّم دعا میں بطور وسیلہ انکا استعمال اور جناب باری میں ان کو ذریعۂ تقرب بنانا۔ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا تمام اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں۔ پس تم ان کے ذریعہ جناب باری میں دعا کرو۔

دعا کے بھی دو مرتبے ہیں - اوّل دعاءِ ثنا و عبادت - دوم دعاء طلب و سوال - خدا کی حمد و ثنا اسماءِ حسنیٰ اور صفات علیا کے ذریعہ کی جائے اور طلب و سوال کے لیے بھی ان ہی کو شفیع بنایا جائے - یہ نہ کہا جائے کہ "اے موجود مجھے بخش دے"۔ یا "اے ذات مجھ پر رحم کر"۔ بلکہ مطلوب کی مناسبت سے اسکے اسماء کو ذریعہ اور وسیلہ بنا کر حرفِ مطلب زبان پر لایا جائے - دراصل سائل اسماءِ حسنیٰ کو وسیلہ قرار دیکر اسکی صفات کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ مطلوب کی رعایت سے اسماء کو اختیار کیا جائے، مثلاً اگر بخشش اور گناہوں کی معافی مطلوب ہو تو اس طرح کہا جائے "اے غفار مجھے بخش دے" اگر سلامتی مطلوب ہو تو یوں کہا جائے "یا سلام میری حفاظت کر"۔ رحم اور بخشش کے موقعہ پر "اے قہار مجھ پر رحم کر" کہنا موزوں نہ ہوگا کیونکہ سائل رحم کا طالب ہے اور اسکے لیے ضروری ہے کہ خدا کی صفت رحم کو اپنی جانب متوجہ کرے - اگر کوئی شخص اپنی سیاہ کاریوں پر نادم ہے اور طلب عفو کیلیے درگاہ الٰہی میں حاضر ہو کر یہ کہتا ہے کہ "اے منتقم مجھے بخش دے" تو اس کا مقصد فوت ہو جائیگا - جس شخص نے انبیاء کرام خصوصیت کے امام الانبیاء اور خاتم الرسل کی دعاؤں پر غور کیا ہے وہ انکو اسی ضابطہ اور اصول کے تحت پائیگا -

(۱۰) جن اسماء کا اطلاق خدا پر بھی ہوتا ہے اور بندوں پر بھی مثلاً حیّ، سمیع، بصیر، علیم، قدیر، انکے متعلق نظار اور متکلمین میں سخت اختلاف ہے - متکلمین کے ایک گروہ کا قول یہ ہے کہ یہ اسماء بندوں کے حق میں حقیقت اور خدا کیلیے مجاز ہیں، یعنی بندوں کیلیے انکا استعمال حقیقی معنی میں ہوتا ہے اور خدا کیلیے مجازی ہیں - دراصل یہ قول فرقہ جہمیہ کا ہے جو تمام اقوال میں اخبث اور فاسد ہے - دوسرا قول پہلے قول کا عکس ہے، یعنی یہ اسماء خدا کیلیے حقیقت اور بندوں کیلیے مجاز ہیں - یہ قول ابو العباس ناشی کا ہے - تیسرا قول یہ ہے کہ یہ اسماء خدا کیلیے بھی حقیقی ہیں اور بندوں کیلیے بھی - یہ قول اہل سنت کا ہے اور یہی حق ہے - یہ اسماء

جب باری تعالیٰ کیلیے استعمال ہونگے تو اسکی شان کے مطابق ہونگے، اور جب بندوں کے حق میں استعمال ہونگے تو انکی جو کچھ حیثیت ہے اسکے مطابق ہونگے۔

دراصل اس نوع کے اسمار وصفات کی تین حیثیتیں ہیں۔ ایک عمومی حیثیت، یعنی اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ وہ باری تعالیٰ کیلیے ہیں یا بندوں کیلیے فی نفسہٖ جو لفظ کا مفہوم ہے صرف وہ پیشِ نظر ہو۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ اسمار خصوصیت کیساتھ اللہ تعالیٰ کیلیے مستعمل ہوئے ہوں تیسری حیثیت یہ ہے کہ انہیں بندوں کے اوصاف پر دلالت کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔

پہلی حیثیت میں تو یہ اسمار مجرد اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ موصوف میں فلاں فلاں اوصاف موجود ہیں، بلا لحاظ اسکے کہ ان کی کیفیت کیا ہے۔ مثلاً لفظ سمیع اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ موصوف میں مسموعات کا ادراک پایا جاتا ہے، اور بصیر اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ موصوف مبصرات کی رویت سے متصف ہے۔ اس لحاظ سے جو ہستی بھی سمع و بصر رکھتی ہوگی وہ بصیر کہلائی جائیگی۔ رہیں بقیہ دونوں حیثیات، تو جب ایک اسم صفت خدا کیلیے استعمال کیا جائیگا تو اس کا اطلاق شان خدائی کے لحاظ سے ہوگا، اور جب وہی اسم بندے کیلیے استعمال ہوگا تو اس کا اطلاق شان بندگی کے لحاظ سے ہوگا۔ خدا کو جب سمیع کہینگے تو اسکے معنی یہ نہ ہونگے وہ ایک خاص آلہ سے سنتا ہے جس کا نام کان ہے، اور ہوا کے واسطہ سے اس تک آواز پہنچتی ہے، اور اسکی سماعت محدود ہے اور بندے کو جب سمیع کہینگے تو اس کے بھی یہ معنی نہ ہونگے کہ وہ کامل تجرّدی شان کے ساتھ بلا واسطہ کائنات کی ہر آواز کو سنتا ہے۔ پس اشتراک فی اللفظ کے باوجود خدا کی صفات اور بندوں کی صفات میں مماثلت ومشابہت کا کوئی امکان نہیں۔

جو لوگ سمیع و بصیر وغیرہ اسمار کا استعمال خدا کیلیے محض اس وجہ سے ممنوع قرار دیتے ہیں کہ خدا کی مخلوق بھی ان صفات میں اسکی شریک ہو جاتی ہے وہ دراصل اسمار کے صحیح استعمال

اور انکی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ بلاشبہ جو لوگ ان اسماء کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ خدا میں اور مخلوق میں مماثلت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ یقیناً خدا کو مخلوق کے ساتھ مشابہت دیتے ہیں اور جو اس جرم کا مرتکب ہو اسکے کفر میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ مگر جو شخص خدا کے حق میں ان اسماء کا استعمال اس طرح کرتا ہے کہ وہ خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہو جاتے ہیں، اور اسی کے کمال اور اسی کی شان و عظمت کو ظاہر کرتے ہیں، اور اسکی کسی صفت میں غیر کو شریک نہیں کرتے، وہ تشبیہ اور تعطیل، دونوں آفتوں سے بچ جاتے ہیں۔

یہ یاد رہے کہ جب ان اسماء کی اضافت بندوں کی طرف ہو تو خدا کے حق میں ان کے اس مفہوم خاص کی نفی ضروری ہے اور اسی طرح جب وہ خدا کی طرف مضاف ہوں تو بندوں کے حق میں بھی نفی ضروری ہے۔ مثلاً جب لفظ حیاۃ بندوں کی طرف مضاف ہو گا تو اسکے مفہوم میں طفولیت، شباب، بڑھاپا، نیند، اکل و شرب اور موت کے تصورات ضرور شامل ہونگے جن سے باری تعالیٰ کی ذات وراء الوراء ہے اور مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ خدا کے حق میں ان تمام لوازم کی نفی کر دے۔ اور جب یہی لفظ حیات خدا کی طرف مضاف ہو گا تو اسکے مفہوم میں ازلی، ابدی، خالق، عالم کل، فعالٌ لما یرید، قدوس، سلام وغیرہ صفات کمالیہ بھی شامل ہونگے جو صرف خدا ہی کے لیے مخصوص ہیں، مخلوق کے حق میں انکی نفی ضروری ہے۔ اگر تم نے اس ضروری قاعدہ کو ملحوظ رکھا تو تم متکلمین کی لائی ہوئی آفتوں سے ہمیشہ کیلیے محفوظ ہو جاؤ گے۔ ایک آفت تعطیل کی ہے جو باری تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کا سرے سے انکار کر دینی ہے، اور دوسری آفت تشبیہ کی ہے جو شرک کا دروازہ کھول کر خدا کی عظمت و جلال کا دلوں سے خاتمہ کر دیتی ہے۔

(۱۱) اللہ تعالیٰ کے اسماء بے شمار ہیں جنکا حصر نہیں کیا جا سکتا اور بہت سے نام ایسے ہیں جنکا علم خدا کے سوا کسی اور کو نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا۔

اسئلك بكل اسم هولك سميت به نفسك او انزلته فى كتابك او استاثرت به فى علم الغيب عندك۔	الٰہی! میں تیرے ان ناموں کے وسیلہ سے تجھسے دعا کرتا ہوں جنکو خود تونے اپنے لیے پسند کیا ہے، یا جنکو تونے اپنی کتاب میں ظاہر کیا ہے، یا جو تیرے خزانۂ غیب میں پوشیدہ ہیں۔

اس حدیث کی رو سے خدائے تعالیٰ کے نام تین قسم کے ہیں اوّل وہ جنکو خود اسنے اپنے لیے پسند فرمایا اور جن پر چاہا ان پر ظاہر کیا اور کسی کتاب میں انکو بیان نہیں کیا۔ دوم وہ نام ہیں جنکو اس نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔ سوم وہ جنکا علم کسی مخلوق کو نہیں دیا گیا۔ حدیث شفاعت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے کہ "اس وقت مجھ پر اسکی حمد و ثنا کا دروازہ کھولا جائیگا، ایسی حمد و ثنا جس کا میں اب ادراک بھی نہیں کر سکتا" اسکا یہی مطلب ہے اور اسکی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ "اے خدا! تونے خود اپنی جس طرح ثنا کی ہے میں اس کا احاطہ بھی نہیں کر سکتا" رہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ ان للہ تسعة وتسعين اسماء من احصاها دخل الجنة (خدا کے ۹۹ نام ایسے ہیں کہ جسنے انکا شمار کیا وہ جنت میں داخل ہوا) سو اس میں "من احصاها دخل الجنة" مستقل خبر نہیں ہے بلکہ صفت ہے اور مطلب یہ ہے کہ خدا کے بے شمار اور بے حد و حساب ناموں میں سے ۹۹ نام ایسے ہیں کہ انکا شمار کرنے والا جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس سے خدا کے دیگر ناموں کی نفی نہیں ہوتی، اور یہ اسی طرح کا قول ہے کہ مثلاً کوئی کہے فلاں شخص کے پاس ایک سو غلام ایسے ہیں جو جہاد کیلیے ہر وقت تیار ہیں، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان ایک سو غلاموں کے سوا اس شخص کے پاس اور غلام نہیں ہیں۔

(۱۲) اللہ تعالیٰ کے بعض نام ایسے ہیں جنکا علحدہ علحدہ استعمال بھی جائز ہے، اور ملا کر بھی، مثلاً قدیر، سمیع، بصیر، عزیز، اور حکیم وغیرہ کہ چاہو تو انکو علحدہ علحدہ استعمال کرو اور چاہو تو ملا کر مگر بعض نام ایسے بھی ہیں جنکا مفرد استعمال جائز نہیں ہے۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ مقابل کے نام بھی ساتھ ہی ساتھ استعمال کیے جائیں۔ مثلاً مانع، ضار، منتقم وغیرہ۔ ان کا استعمال مفرد نہیں بلکہ انکے مقابل اسماء معطی، نافع اور عفوّ کے ساتھ کیا جائیگا، یعنی اس طرح کہا جائیگا کہ وہ معطی اور مانع ہے، ضار اور نافع ہے، منتقم اور عفوّ ہے، معزّ اور مذلّ ہے۔

(۱۳) صفات کی چار قسمیں ہیں (۱) صفات کمال (۲) صفات نقص (۳) وہ صفات جو کمال اور نقص دونوں سے خالی ہیں (۴) وہ صفات جو کمال اور نقص دونوں کی جامع ہیں۔ اللہ تعالیٰ اقسام ثلاثہ سے مبرّا و منزّہ، اور صرف قسم اول کی صفات سے موصوف ہے، کیونکہ اسکی کل صفات، صفاتِ کمالیہ ہیں۔ اسی طرح خدا کے اسماء بھی کمال محض ہیں جن سے بہتر نہ دوسرے اسماء ہو سکتے ہیں، نہ .. بمعنویت کے اعتبار سے دوسرے اسماء ان کے قائم مقام بن سکتے ہیں۔ یوں تم کسی اسم کی تفسیر کسی دوسرے اسم سے کر لو لیکن کتاب و سنت میں جو اسماءِ باری مذکور ہیں، ان کے مترادف دوسرے اسماء تمکو ہرگز نہ ملیں گے کیونکہ یہ اسماء ہر اعتبار سے احسن و اکمل اور شائبۂ عیب و نقص سے پاک ہیں۔ وہ علیم و خبیر ہے مگر تم اسکو عاقل اور فقیہ نہیں کہہ سکتے۔ وہ سمیع و بصیر ہے مگر سامع اور باصر کے الفاظ ان کے قائم مقام نہیں بن سکتے۔ وہ رحیم و رؤف ہے، مگر رفیق و شفیق میں وہ کمال کہاں ہے۔ وہ علی العظیم ہے، مگر رفیع و شریف اسکا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ ہم اسکو کریم کہتے ہیں مگر غلطی ہو گی اگر اسکو سخی کہنے لگیں۔ وہ خالق ہے باری ہے مصور ہے، مگر فاعل، صانع اور مشکّل میں وہ بات نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ صفات کی طرح اسماءِ باری بھی احسن و اکمل ہیں، اسلیے دوسرے اسماء اور دوسری صفات

ان کی قائمقامی کا شرف حاصل نہیں کر سکتیں ۔

(۱۴) اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الحاد کرنا سخت ترین معصیت ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (اللہ کے لیے اچھے اچھے نام ہیں ۔ انہی سے اس کو پکارا کرو ۔ اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جو اس کے ناموں میں الحاد کرتے ہیں ۔ وہ اپنے کیے کا پھل پائینگے) الحاد کا مادہ، ل ۔ ح ۔ د ہے جسکے معنی ہیں حق سے باطل کی طرف مائل ہونا ۔ ابن سکیت کا قول ہے کہ "ملحد اس شخص کو کہتے ہیں جو حق سے باطل کی طرف مائل ہو اور حق میں باطل کی آمیزش کرے" اسماء الٰہی میں الحاد کی متعدد انواع ہیں ۔ (اول) یہ کہ خدا کے ناموں کو بعینہ یا تھوڑا سا بگاڑ کر غیر اللہ کو ان سے موسوم کیا جائے، جیسے اللہ سے لات اور عزیز سے عُزّیٰ بنا کر بتوں کو ان ناموں سے موسوم کرنا یا غیر اللہ کو رب کہنا ۔ (دوم) یہ کہ خدا کیلیے ایسے نام تجویز کیے جائیں جو اسکی عظمت و شان کے منافی ہوں مثلاً عیسائیوں کی طرح خدا کو باپ کہہ کر پکارنا یا فلاسفہ کی طرح اسکو موجب بالذات اور علت فاعلہ بالطبع قرار دینا (سوم) یہ کہ خدا کی طرف نقائص منسوب کیے جائیں مثلاً یہود کی طرح اسکو فقیر کہنا یا یہ کہنا کہ مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اس نے آرام کیا (چہارم) یہ کہ اسماء کو انکے معانی اور حقائق سے محروم کر دیا جائے جیسا کہ فرقہ جہمیہ کا قول ہے کہ اسماء الٰہیہ مجرد الفاظ ہیں جن میں نہ صفات کا وجود ہے نہ معانی اور حقائق کا ۔ وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ خدا سمیع، بصیر، حی، رحیم، متکلم اور مرید ہے، مگر ایسا حی جسکو حیات حاصل نہیں، ایسا سمیع و بصیر جسکو سمع و بصر کی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، ایسا متکلم اور مرید کہ اس کے پاس نہ کلام ہے نہ ارادہ ! یہ الحاد معنوی اور شرعی اعتبار سے نہایت خطرناک ہے اور مشرکین کے الحاد سے بالکل مشابہ، کیونکہ مشرکین نے خدا کے اسماء اور صفات کو بتوں کے حوالہ کر دیا اور جہمیہ نے خدا کی صفات ہی کا انکار کر دیا ۔ (پنجم) یہ کہ خدا کی صفات کو مخلوق

کی صفات سے تشبیہ دیجائے جیسا کہ مُشبّہہ کا عقیدہ ہے - انہوں نے جہمیہ یعنی اہلِ تعطیل کے مقابلہ میں یہ مذہب ایجاد کیا ہے اور بظاہر دو متقابل فریق بنگئے ہیں، مگر الحاد میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ معطلین صفات الٰہیہ کی نفی کرتے ہیں اور اہل تشبیہ خالق کی صفات کو مخلوق کی صفات سے لا ملاتے ہیں - اہلِ سنت کا کام یہ ہے کہ وہ افراط و تفریط کی ان راہوں سے بچیں اور تشبیہ و تعطیل کے الحاد سے اپنا دامن بچائیں - نہ تو اہلِ تشبیہ کی طرح خدا کو بت بنائیں اور نہ اہلِ تعطیل کی طرح اسکو معدوم سمجھیں - واللہ ذو الفضل العظیم -

---

شعلۂ طور

دوسرا ایڈیشن

شاعر رنگین حضرت جگر مرادآبادی کے کلام سے کون واقف نہیں - انکے کلام کے مجموعہ کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ نے ۱۰ر نومبر کو شائع کیا ہے - اس مرتبہ موصوف کی چند نئی غزلوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے -

سادگی و پرکاری، بیخودی و ہوشیاری جو فارسی میں امیر خسروؒ کے کلام کی خصوصیت ہے اردو میں جگر مرادآبادی کے حصہ میں آئی ہے - جگر کی ساحرانہ شاعری کا اس دور میں جواب نہیں - جو حضرات ایکدفعہ بھی شعلۂ طور پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال چکے ہیں وہ اسے اسطرح لیے پھرتے ہیں جیسے کہ لوگ زمانۂ انقلاب فرانس میں معاہدۂ عمرانی لیے پھرتے تھے -

طباعت وغیرہ اعلیٰ، از حد دیدہ زیب، پنچ رنگی سنہرا کور، مضبوط و خوبصورت جلد اور جگر کی ایک بے نظیر تصویر - ان تمام خصوصیات کے باوجود ہم نے قیمت میں کمی کر دی ہے -

یعنی سے ر کے بجائے عہ ر

مکتبہ جامعہ - دہلی - نئی دہلی - لاہور

حیات اجتماعیہ

(از جناب چوہدری غلام احمدؐ صاحب پرویز)

اسلام کے سوا جتنے مذاہب عالم ہیں انہیں اگر آپ غور سے دیکھینگے تو ایک چیز ان سب میں بطور ایک قدر مشترک کے نظر آئیگی - ان میں عام طبقہ "دنیاداروں" کا ہوگا، اور ان میں کا جو شخص "مذہبی" یا "دیندار" ہوگا وہ دنیاداروں کے طبقہ سے الگ ہوتا جائیگا، یعنی دنیادار اور "دیندار" دو الگ الگ جماعتیں ہونگی - دنیادار ہر چند ان دینداروں کی ضروریاتِ زندگی کے کفیل ہونگے، لیکن ان دینداروں کا دنیا سے کچھ واسطہ نہ ہوگا- ان میں سے ہر شخص اپنی انفرادی زندگی بسر کریگا - اس کا منتہائے نگاہ یہ ہوگا کہ کسی طرح اس کی اپنی مکتی (نجات) ہو جائے - اور چونکہ دنیا میں دینداروں کا طبقہ ہمیشہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس لیے کہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ حضرات اس منزل سے بہت قریب ہیں جو تخلیقِ انسانی کا مقصد ہے، لہذا ان مذاہب کے نزدیک انسانی زندگی کا نصب العین یہ ہے کہ وہ انفرادیت کی زندگی بسر کرے - تمدن و حضارت کی زندگی بسر کرنا دنیاداروں کا کام ہے جو شرفِ انسانیت کی منزل سے دور ہوتے ہیں - اسلام نے سب سے پہلے اس نظریہ کی تردید کی اور دنیا کے مذاہب میں یہ اعلان اُسی کی طرف سے ہوا کہ انفرادیت کی زندگی بسر کرنا قطعاً فطرتِ انسانی کا مقتضیٰ نہیں، فطرت انسانی کا تقاضا ہے کہ اجتماعیت کی زندگی بسر کی جائے، لہذا مذہب، جو انسان کو اسکے مقصدِ تخلیق سے قریب لانیکا ذریعہ ہے وہی فطرت کے مطابق ہو سکتا ہے جو انسان کو اجتماعیت کی زندگی بسر کرنا سکھلائے، جس میں

"دنیاداروں" اور "دینداروں" کے الگ الگ گروہ نہ ہوں۔

دنیا اس حقیقتِ عظمیٰ کو بہت کم سمجھ سکی ہے اس لیئے کہ دنیا، باین ہمہ ادعائے علم و بصیرت ابھی تک یہی متعین نہیں کر سکی کہ انسانی فطرت ہے کیا۔ اس باب میں دنیا نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا ہے کہ ہر دور کے انسانوں کی مجموعی حالت کی اوسط (Average.) لیکر اسے فطرتِ انسانی کہہ دیا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ فرد ہو یا افراد کا مجموعہ، اس پر ماحول، قومی روایات بچپن کے نقوش، وراثتی رجحانات کا اسقدر اثر ہوتا ہے کہ فطرتِ اصلیہ انکے نیچے دب جاتی ہے اور جسے فریبِ نظر سے فطرت کہا جاتا ہے وہ دراصل انہی خارجی اثرات کے مجموعی نتیجہ کا نام ہے یورپ آج علم و عقل کی انتہائی بلندیوں پر سمجھا جاتا ہے، لیکن اس نے بھی جہاں عالمِ آفاق کے متعلق اسقدر تحقیق و تفتیش کی ہے، وہاں عالمِ نفس کے متعلق جس بہالت اور بے بصری کا ثبوت دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے ہاں کے علمار نفسیات آجتک یہی متعین نہ کر سکے کہ خارجی اثرات کیا ہیں اور صحیح فطرتِ انسانی کیا ہے۔ البتہ اب وہاں ایک ایسی جماعت پیدا ہو رہی ہے جس نے علمِ تجزیۂ نفس (Psycho-analysis.) کے ذریعہ سے ان خارجی اثرات اور فطرتِ اصلیہ میں کچھ تمیز کرنا... شروع کیا ہے۔ ان کی تحقیق ابھی عالمِ طفولیت میں ہے، اس لیے اس کے نتائج بھی ہنوز دھندلے سے ہیں۔ لیکن جہاں بھی یہ ذرا کامیاب ہوئے ہیں وہاں انکے ذہنی دھندلکے میں حقیقت کی روشنی نظر آجاتی ہے۔

ان علمار میں ایک صاحب ڈاکٹر بیرن ولف (Beran Wolfe.) ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک مختصر سی کتاب لکھی ہے جسکا عنوان ہے کہ "ہم باوجود انسان ہونے کے کس طرح خوشی کی زندگی بسر کر سکتے ہیں" (How To Be Happy Though Human) اس میں اس ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ حقیقی اطمینان و مسرت کی زندگی اسی صورت میں بسر کی جا سکتی ہے کہ

انسان کی زندگی اسکی فطرت کے مطابق ہو- اس باب میں اس نے اپنے ، اور اپنے ہم عصر دیگر ائمہ فن کے تجزیہ نفسی کے تجربات ومشاہدات کی بنار پر بتایا ہے کہ فطرت کے مطابق زندگی کونسی ہے ایک شخص جب اس کتاب کو، یا اسی فن کے دوسرے ائمہ کی کتابوں کو پڑھتا ہے تو اگر اسے .. قرآن کریم سے کچھ : اقفیت ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ یہ لوگ اتنی کدو کاوش کرنے کے بجائے قرآنِ کریم ہی کو کیوں نہیں پڑھ لیتے - اس لیے کہ یہ حضرات اپنی عمر بھر کی جانکاہی وجگر کاوی کے بعد اگر کسی ایسے نتیجہ تک پہنچتے ہیں جو یقینیات کی حد میں داخل کیا جا سکے تو وہ وہی ہوتا ہے جو قرآن کریم میں چودہ سو برس پیشتر سے موجود ہے۔

ڈاکٹر دلف نے اپنی مذکورہ صدر کتاب میں انفرادیت اور اجتماعیت کی زندگی کے متعلق بھی جدید تحقیقات کے نتائج کو بیان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ فطرتِ انسانی کے مطابق کونسی زندگی ہے۔ اس امر کے ذکر سے میرا یہ مطلب نہیں کہ قرآنِ کریم کی صداقت کی یہ دلیل ہے کہ یہ حضرات بھی اسکے مسلمات کی تائید کرتے ہیں قرآن کریم کے حقائق تو قوانین فطرت کی طرح اٹل اور غیر متبدل ہیں حقیقت حقیقت ہے، خواہ دنیا میں اسکی تائید کرنیوالا کوئی بھی باقی نہ رہے اگر ساری دنیا اپنی آنکھیں بند کرے تو بھی سورج کی روشنی میں ذرہ بھر فرق نہیں آسکتا کہ سورج اپنی روشنی اور تمازت میں دوسروں کی بینائی کا محتاج نہیں ۔ مقصد اس سے یہ بیان کرنا ہے کہ دنیا ظن اور قیاس کی ٹھوکریں کھانیکے بعد جب کبھی کسی حقیقت تک پہنچیگی تو وہ حقیقت وہی ہوگی جو قرآن کریم کے اندر مذکور ہے ۔ صحیح فطرتِ انسانی وہی نکلیگی جو حقائق قرآنی کے مطابق ہوگی

ڈاکٹر دولف لکھتا ہے کہ تمام مخلوقات میں ایک انسان ہی ایسا ہے جسے قدرت نے بالکل نہتا پیدا کیا ہے، لیکن اس کمزوری کا بدل اسے یہ دیا ہے کہ وہ مدنی الطبع بنا دیا گیا ہے، اور اسکی فطرت میں اس امر کو ودیعت کر کے رکھدیا گیا ہے کہ وہ انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کی زندگی بسر کرے ۔ لہذا ہر وہ نظریۂ زندگی جو انسان کو انفرادیت کی طرف مائل کرتا ہے اور اجتماعیت

سے قطع علائق کی ترغیب دیتا ہے یکسر غیر فطری جذبہ پر مبنی ہے۔ وہ مسائل حیات جن سے انسان کو سابقہ پڑتا ہے بالعموم تین شقوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ سوسائٹی کے معاملات، تقسیم عمل کے معاملات اور صنفی تعلقات (Sexual relations) کے معاملات۔ چونکہ حیات ایک مربوط شے ہے اس لیے تمام نوع انسانی، باوجود الگ الگ افراد ہونیکے، دراصل ایکدوسرے کیساتھ پیوست ہے۔ اس لیے ہر شخص کو اس معاملہ میں آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا کہ وہ ان مسائل حیات کا حل کسطرح تجویز کرتا ہے۔ یہ اسکی زندگی کا کوئی ذاتی (پرائیویٹ) معاملہ نہیں، بلکہ سوسائٹی کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ جہاں کوئی شخص ان مسائل میں سے کسی مسئلہ کا غلط حل تجویز کرتا ہے۔ یا کوئی غلط راستہ اختیار کرتا ہے، تو ہر چند بظاہر یہ اسکی اپنی ذات کا معاملہ سمجھا جاتا ہے، لیکن چونکہ درحقیقت اسکی اپنی ذات دیگر نوع انسانی سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لیے اسکا یہ اقدام تمام نوع انسانی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر ہم ان معاملات میں نوع انسانی سے تعاون و معاونت ترک کردیں، اور یہ سمجھ کر کہ یہ معاملات میرے اپنے ذاتی معاملات ہیں، انسانیت کی مشترکہ ذمہ داریوں سے اعراض برتیں، تو ہم فطرت کے اٹل قانون کی رو سے یقیناً ان فوائد سے محروم رکھے جائینگے جن سے بہ حیثیت انسان ہونیکے ہمیں متمتع ہونا تھا۔ جو لوگ اس قسم کی پہلوتہی کی روش اختیار کرتے ہیں وہ عقل حیلہ جو کے نظر فریب دلائل سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی ہزار کوشش کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھی دھوکا دیتے ہیں اور دوسروں کو بھی۔ انکی یہ روش حقائق سے چشم پوشی اور ان سے دوچار ہونیکے خوف پر دلالت کرتی ہے۔

اس تجزیہ سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ جتنا کوئی شخص اپنی متاع ہنر سے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ اطمینان و مسرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ کامیاب زندگی بسر

کرنیکے لیے اپنی خودی کے استحکام اور اسکے ذریعہ سے ہئیت اجتماعیہ کی نفع رسانی کا نصب العین سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اور یہ نصب العین سامنے نہیں رکھا جا سکتا جب تک انسان کے دل میں ایک ایقانی جذبہ کے ماتحت ولولہ اور جوش، اور اس کے دماغ میں علم وبصیرت نہ ہو۔ یاد رکھو کہ فطرت کے اٹل قوانین کے سامنے اصلح ثابت ہونے کیلیے اجتماعی زندگی کا نصب العین ہی اولین و آخری ذریعہ ہے۔ وہ تہذیب جو انفرادیت کی زندگی سکھائے، انسانیت کیلیے بمنزلہ طاعون ہے ایسا طاعون کہ جسکے سامنے دنیا کی ہر مہلک سے مہلک وبا ہیچ ہو۔

دوسری چیز کے متعلق یہ یاد رکھو کہ حیاتِ اجتماعیہ ہر فرد کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ لیکن وہ فرد سے اس کا مطالبہ بھی کرتی ہے کہ وہ اس حیات اجتماعیہ کی کفالت کیلیے اپنی قوت عمل کو بروئے کار لائے۔ لہذا یہ کسی آدمی کا ذاتی معاملہ نہیں ہے کہ وہ سوسائٹی کیلیے کچھ کام کرتا ہے یا نہیں۔ بلکہ ہر انسان پر اس ہئیتِ اجتماعیہ کا ایک جزو ہونیکی حیثیت سے لازمی ہے کہ وہ ایک عملی زندگی بسر کرے۔ ایک فرد اپنے لیے مناسب و موزوں کام کا انتخاب تو کر سکتا ہے۔ اس میں وہ مختار ہے۔ لیکن اسے کبھی اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اس جماعت میں ایک عضوِ معطل کی حیثیت اختیار کرے۔

تیسری چیز جنسی تعلقات کی ذمہ داریاں ہیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ یہ تعلق ایک فرد یا ایک جوڑے کا ذاتی معاملہ ہے جس میں سوسائٹی کے قوانین کو دخل انداز ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ہئیتِ اجتماعیہ کا ایک اہم معاملہ ہے، اس لیے اس مسئلہ کا حل بھی ان قوانین کی رو سے ہونا چاہیے جو ہئیتِ اجتماعیہ کے متعلق متعین کیے گئے ہوں۔ اس باب میں اتنا یاد رکھیے کہ جسقدر کوئی نوع ارتقائی منازل میں آگے بڑھ چکی ہوگی اسی قدر اس نوع کے نر و مادہ کے درمیان ہئیتِ کذائی اور شکل وصورت میں فرق نمایاں ہوتا جائیگا۔ اور جتنا یہ فرق نمایاں ہوگا اتنا ہی اُن

دونوں کی تقسیم کار میں بھی فرق ہوتا جائیگا - انسان اس باب میں موجودہ سلسلۂ ارتقار کی آخری کڑی ہے - اس لیے اسکے نر و مادہ میں فرق محسوس طور پر نظر آتا ہے - لہذا ان کی ذمہ داریوں کے میدان بھی اسی لحاظ سے مختلف ہونے چاہیں - ان ذمہ داریوں کا تعیّن بھی ہر شخص کی اپنی مرضی پر نہیں چھوڑا جاسکتا، بلکہ مطمئن زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا حل بھی ہیئیتِ اجتماعیہ کے قوانین کی روشنی میں تلاش کیا جائے - اور جب تک ایسا نہیں کیا جائیگا نوعِ انسانی کبھی سکون کی زندگی بسر نہیں کرسکیگی - یاد رکھیے کہ تجرد کی زندگی بسر کرنے والا ہیئیتِ اجتماعیہ کی ذمہ داریوں سے جی چراتا ہے - اس لیے نوعِ انسانی کی مشترکہ حفاظت اور مسرت سے بہرہ یاب ہونیکا اسے کوئی حق حاصل نہیں - تجرد، جو نظریۂ انفرادیت کا ہی ایک مظاہرہ ہے، یکسر غیر فطری زندگی کا نام ہے جس سے سوسائیٹی اور تہذیب کا وجود فنا ہو جاتا ہے - انفرادیت کی زندگی تو صرف نیند کی حالت میں ہو سکتی ہے - جاگنے والوں کے لیے یہ زندگی زہرِ قاتل ہے -

---

یہ ہیں ایک مغربی ڈاکٹر، ماہر نفسیات کے خیالات - انکو دیکھیے اور پھر قرآنِ کریم کی تعلیم پر غور فرمائیے، اور سوچیے کہ دنیا علم و عقل کی جن بلندیوں تک چاہے اڑ کر چلی جائے، قرآن کریم کسطرح وہاں سے بھی دس قدم آگے ہی آگے نظر آتا ہے - دنیا جوں جوں علمی انکشافات میں آگے بڑھتی جاتی ہے، مذاہبِ عالم گھبراتے جاتے ہیں کہ اسکا لازمی نتیجہ مذہب سے تنفر اور بیگانگی ہوگا - لیکن اسلام اتنا ہی زیادہ خوش ہوتا ہے کہ دنیا خود بخود میرے قریب آتی جا رہی ہے - اس لیے کہ اسلام کے خدائے سمیع و بصیر کا یہ ارشاد ہے کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ "ہم ان کو اس کائنات میں اور خود ان کی اپنی ذات میں اپنی نشانیاں دکھائینگے تاکہ ان پر یہ بات کھل جائے کہ یہی قرآن حق ہے"۔

معرکۂ اسلام وجاہلیت

بدء الاسلام غریبا وسیعود غریبا

از جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

(۳)

یہ ہے "بدء الاسلام غریباً" کی اصل تصویر۔ لیکن اگر اس تصویر کو اور زیادہ نمایاں دیکھنا ہو، اور اس امر کا اندازہ لگانا مقصود ہو کہ نظریات اسلامی اپنی ٹھیٹھ عقلیت کی بنا پر کس قدر "غریب" ہیں اور ذہن انسانی کی گرفت میں آنے کیلیے کتنی اعلیٰ درجہ کی عقلی اور اخلاقی تربیت چاہتے ہیں، تو ان بندگانِ جہل کو چھوڑ کر آگے چلو اور دیکھو کہ وہ گروہ جو انتہا درجہ کا پاک طینت اور سلیم الفطرت تھا، جو صداقت کو پہچاننے اور ماننے میں کمال درجہ پر پہنچا ہوا تھا، جس نے نفس پرستی اور جاہلیت کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں نورِ نبوت کو پاکر اپنی صحتِ نظر کا ثبوت دیدیا تھا، جو ضد اور شقاق سے پاک، اتباعِ نفس سے آزاد، اور شرح صدر کی نعمت سے بہرہ ور تھا، وہ بھی اسلام وجاہلیت کے اس معرکہ میں کتنی کشمکش سے دوچار ہوا، اسلام کی انتہائی عقلیت کو پوری طرح ذہن نشین کرنے میں اسکو بھی کتنا سخت مجاہدہ کرنا پڑا، کس کس طرح جاہلیت نے چور دروازوں سے غیر محسوس طور پر اسکے اندر نفوذ کرنیکی سرتوڑ کوششیں کیں اور کیسی زبردست اخلاقی ٹریننگ اور انقلابی تعلیم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس قابل بنایا کہ نفسانی خواہشات اور موروثی افکار اور عصری تصورات سے بالکل آزاد ہو کر ٹھیٹھ فطری حقائق، اور خالص معقولات کا ادراک کر سکے۔ اس منظر کو دیکھ کر آدمی ششدر

رہ جاتا ہے، اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ افراط و تفریط کے ہنگامہ زار میں خالص عقلی اور فطری اعتدال کی بال سے زیادہ باریک راہ کا ادراک کرنا اور قوت تمیز و قوت ارادی کی کامل بیداری کے ساتھ اس پر ثابت قدم رہنا کسقدر کٹھن کام ہے، اور کیسا انسان کامل تھا وہ بشر جو نہ صرف خود اس راہ پر کمال درجہ استقامت کیساتھ چلا، بلکہ جس نے دوسرے انسانوں کو بھی اپنی تعلیم و تربیت سے اس پر چلنے کے قابل بنایا۔

اب اس اجمال کی تفصیل سنو، یعنی اس نظریہ کے شواہد۔

مبادی اسلام (توحید، معاد اور نبوت) سے اس گروہ کو اگر کوئی اجنبیت ہوسکتی تھی تو وہ قبول اسلام سے پہلے تک تھی۔ اسلام میں داخل ہو جانیکے بعد اس کے ظہور کا کوئی موقع باقی نہ تھا، کیونکہ حکمت الٰہی نے نبوت کے تیرہ برس محض اسی جڑ کی مضبوطی میں صرف کر دیے تھے جس سے دین فطرت کے تمام برگ و بار نکلنے والے تھے۔ اس نے جاہلیت کے اقنوم اعظم (شرک) پر پے بہ پے ایسی کاری ضربیں لگائیں کہ دوبارہ اس کا سر اٹھانا ناممکن ہوگیا۔ موسوی امت تو ایمان لانیکے بعد بھی بتوں اور مجسموں کو دیکھکر بے تابانہ سربسجود ہو جانا چاہتی تھی، اگر صحابۂ کرام کی تعلیم و تربیت اتنی مکمل ہوئی تھی کہ وہ انہیں اپنے پیروں سے مس کرنا بھی ذوقِ ایمان کی حق ناشناسی خیال کرتے تھے۔

لیکن اسلام کا فلسفۂ توحید اور لا الٰہ الا اللہ کا سرِّ نہاں! اللہ اکبر! اس کی گہرائی اور بے کرانی کو ہضم کرنے کیلیے صدیق اکبر اور فاروقِ اعظم کا ظرف چاہیے۔ اسلام نے اگر شجر و حجر جیسی ادنیٰ مخلوق کے سامنے سے انسانی پیشانیوں کو اٹھا کر سربلند کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کیا کہ بڑے سے بڑے انسان کو بھی خدائی کے تخت سے اتار کر عام انسانوں کی طرح عجز و نیاز کی سطح پر لا کھڑا کیا اور بتایا کہ خدا نے کسی ذات بشری کو کوئی امتیازی حق نہیں دیا ہے۔ اسکی سنت سب کیلیے

ایک ہے۔ فطرت کے نوامیس کسی شخصیت کا خاص احترام کرنا نہیں جانتے۔ اگر کسی کو کوئی شرف ہے تو محض اس کے آگے جھکنے کا ہے، اور نہ قدرت اور عزت سب اسی ہستی مطلق کیلیے ہے باقی ساری کائنات بے چارۂ محض ہے، اور اس بیچارگی میں سب برابر ہیں۔ لیکن دنیا تو ہر بلندی کے آگے سر ٹیک دینے کی خوگر تھی اور ہر بزرگ انسان کو مقام بشر سے کچھ نہ کچھ برتر ہی سمجھتی آرہی تھی چنانچہ اس تخیل کا اثر مٹتے مٹتے بھی کبھی کبھی نمایاں ہو جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یکسالہ لختِ جگر حضرت ابراہیم نے جس دن وفات پائی اتفاق سے وہی سورج گرہن کا دن بھی تھا۔ بعض صحابۂ کرام نے اُسی قدیم تخیل کے مطابق گمان کیا کہ آج کا گرہن جگر گوشۂ رسول کی وفات کا نتیجہ ہے۔ حضورؐ نے فوراً اس نظریہ کی اصلاح کی اور لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ چاند اور سورج خدا کی قدرت کے نشان ہیں۔ کسی کے مرنے جینے سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔ کوئی انسان خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو نظامِ کائنات پر کوئی حق اور اثر نہیں رکھتا۔ جس قانون بے اختیاری کے ماتحت ایک بھکاری مرتا ہے اور زمین و آسمان اسکا ماتم نہیں کرتے، اسی کے مطابق سلطانِ وقت بلکہ پیغمبر بھی مرتا ہے اور نہ زمین اس سے متاثر ہوتی ہے، نہ آسمان آنسو بہاتا ہے، نہ چاند سورج گرہن کا ماتمی لباس پہنتے ہیں۔

غالباً یہی شخصی عظمت کا تخیل تھا جس نے رحلت مصطفوی کے وقت اضطراری طور پر حضرت عمرؓ تک کو تھوڑی دیر کیلیے مغلوب کر لیا تھا۔ اگرچہ قرآن نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی خدا کے قانون سے مستثنیٰ نہیں، رسول اعظم ہو یا حقیر ترین انسان موت سب کو آنی ہے:۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (زمر۔۳) اے پیغمبر بلاشبہ تم بھی مرنے والے ہو اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں۔

حتیٰ کہ اس نے "اِنَّکَ مَیِّتٌ" کے ظہور کیلیے کسی خاص وقت کی تعیین بھی نہ کی تھی، کفر کی شکست، حق کی فتح، اعدار کی بیخ کنی اور اسلام کے فروغ کا جو وعدہ تھا اس کے بارے میں بھی رب العزت نے نہایت بے نیازی سے آگاہ کردیا تھا کہ "تمہاری زندگی ہی میں اس وعدہ کا ایفا کچھ ضرور نہیں، اگر ہم چاہینگے تو تمہیں وہ وقت دکھا دینگے اور اگر چاہینگے تو اس سے پہلے ہی تمھیں اٹھا لینگے" وَ اِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلَاغُ وَ عَلَیْنَا الْحِسَابُ (رعد - ۶) لیکن ان تمام تصریحات کے باوجود اس جگر گداز خبر کو سن کر کہ آنحضور صلعم نے وفات پائی، حضرت عمرؓ جیسا امثل . . . . تربیت یافتہ مسلمان بھی وفور جذبات میں توازن کھو دیتا ہے، تھوڑی دیر کیلیے بھول جاتا ہے کہ قضائے الٰہی کے سامنے بالا و پست سب ایک ہیں، اور حیران ہو ہو کر سوچتا ہے کہ اتنی بڑی ہستی کس طرح اس معمولی انداز سے گذر جا سکتی ہے! پیغمبرانہ شخصیت کی بزرگی کا جو سکہ نفس میں مرتسم تھا اسکی بناء پر وہ آپ کی وفات کا یقین کرنے کیلیے تیار نہ، تھے ــ تلوار کھینچ کر بولے "اگر کسی نے یہ کہا کہ رسول اللہ کا انتقال ہو گیا تو اسے قتل کر دونگا" اس وقت وہ شخص اٹھا جو اسلام کی اسپرٹ کو جذب کرنے میں انبیاء کے مقام کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے آیت اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ پڑھکر بشریت اور الوہیت کے فرق کو واضح کیا اور فرمایا "جو تم میں سے محمدؐ صلعم کو پوجتا تھا وہ جان لے کہ محمدؐ صلعم وفات پا گئے لیکن جو اللہ وحدہٗ لاشریک کا پرستار تھا اسے معلوم ہو کہ اللہ زندہ ہے" یہ سنکر حضرت عمرؓ کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے ایسا محسوس کیا کہ کوئی چیز یکایک ان کو بے ہوشی سے ہوش میں لے آئی ہے۔

اسلام کے اُس جامع اور عظیم الشان نظریۂ مذہب کو لوجسے وہ کہیں وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ کے الفاظ میں بیان کرکے ساری کائنات ارضی و سماوی

کے ایک ایک ذرہ اور اسکی ایک ایک حرکت کو "اسلام" سے تعبیر کرتا ہے، کہیں يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ کہکر اعلان کرتا ہے کہ ماہتاب کی ضیا پاشی آفتاب کی حرارت رسانی لیل و نہار کی آمد و رفت، سیارگان فلک کی گردش، زمین کی روئیدگی، آگ کی تپش، پانی کی روانی، یعنی عناصر کائنات کی ایک ایک قوت و فعل "تسبیح الٰہی" ہے، اور کہیں پھر اسی اصول کے تحت مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ، کہکر انسان کے ہر قول و عمل، اسکے تمام افکار و عواطف اور اسکے سارے عقائد اور معاملات کو بشرطیکہ اسی رب السموات والارض کے متعین کیے ہوئے حدود کے اندر ہوں، عبادت بتلاتا ہے۔ اسلام اور تسبیح و تعبد کے اس عظیم الشان اور وسیع نظریہ کو جسکی پہنائی انسان ہی پر نہیں، کونین پر چھائی ہوئی ہے، اپنے اندر جذب کر لینے میں صحابۂ کرام کو بھی حیرت و استعجاب کے صدہا مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، فِي بُضْعِ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ یعنی تمہارا اپنی بیویوں سے تمتع کرنا بھی صدقہ ہے۔ صحابۂ کرام نے متعجب ہوکر پوچھا یا رسول اللہ انسان تو محض اپنی شہوت پوری کرتا ہے کیا اس میں بھی اجر اور نیکی ہے؟ آپ نے سمجھایا کہ انسان کا ہر فعل جو حدود شرعی کے اندر ہو باعثِ اجر ہے۔ اللہ کے قانون طبیعی کا منشا پورا کرنے میں اگر تم اپنے نفس کی شہوات کا اتباع کرتے ہو تو سزا کے مستحق ہو، اور اگر اللہ ہی کے قانون شرعی کا اتباع کرتے ہو تو اجر و ثواب کے مستحق ہو۔ جس طرح نماز عبادت ہے اسی طرح ایک خالص دنیوی معاملہ حتیٰ کہ عورت اور مرد کی مقاربت بھی عبادت ہے اگر مشروع طریقہ سے سرانجام دی گئی ہو، کیونکہ یہ تمام چیزیں اسی ایک سلسلۂ حیات کی مختلف کڑیاں ہیں جسکا ایک سرا دنیا کے عام معاملات سے ملا ہوا ہے اور دوسرا عبادات اور روحانیات سے۔ ان میں تفریق پیدا کرنا نظام اسلامی کو درہم برہم کر دینا ہے۔

اسلام کا نظریۂ خلافت جیسا شدید انقلابی نظریہ تھا، اسکی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ قرآن نے جب اس غیر مانوس نظریہ کا اعلان کیا تو دنیا نے کیسے اچنبھے کیساتھ اسے سنا اور ماننے

سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ جس چیز کو نفسانی اغراض کی شکارگاہ سمجھتی تھی اسے اسلام نے ایک خالص اور پاک مذہبی فریضہ بنا دیا تھا۔ اس وقت تک استحقاقِ حکومت کے مختلف نظریے قائم تھے، مثلاً دنیا یہ تسلیم کرنے کیلیے تیار تھی کہ جو جواں ہمت اپنی قوت بازو سے ایک سلطنت قائم کرتا ہے اسکی اولاد کو حق پہنچتا ہے کہ اسے اپنی وراثت سمجھکر جس طرح چاہے اس سے متمتع ہو۔ وہ اس نظریہ کو بھی مانتی تھی کہ کسی قوم یا ملک پر حکومت کرنا صرف اُسی قوم کا حق ہے۔ اُسکی کتابِ سیاست میں یہ اصول بھی موجود تھا کہ جس گروہ نے سامان جنگ کی فراہمی میں مال و اسباب کی قربانی دی ہو، جس نے اپنے خون کی آبیاری سے پادشاہی کا پُر بہار باغ تیار کیا ہو وہی اس بات کی مستحق ہے کہ اپنے خون کی قیمت لے اور اس "پُر بہار باغ" کی بہار آفرینیوں کا مزہ اٹھائے، یعنی جو سر معرکۂ کارزار میں کٹنے کیلیے گیا تھا شاہانہ جلال کا تاج بھی اسی پر ہونا چاہیے۔ یہ اور ایسے ہی بے شمار اصول اسکی "کتاب سیاست" میں موجود تھے۔ ہاں اگر کوئی اصول نہ تھا تو محض اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ کا۔ اگر کوئی ناقابلِ قبول نظریہ تھا تو صرف یہ کہ قومیت، وطنیت، وراثت وغیرہ کے تمام مطالبات ٹھکرا کر محض صالحیت، دیانت، تقویٰ اور حزم و تدبر کو استحقاقِ خلافت کا معیار قرار دیا جائے۔ حکومت کے نظریوں اور اصولوں کو وضع کرنے میں نفس، جاہلیت، شہوت، پیٹ سبھی شریک تھے، اگر کوئی چیز شریک نہ تھی تو محض عقل اور دیانت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نے جب ان نظریات کے مقابلہ میں خلافت کے ایک اچھوتے اور نامانوس تصور کو پیش کیا اور بتایا کہ یہ تختِ حکومت پھولوں کی سیج نہیں ہے جسکی طمع کی جائے، بلکہ کانٹوں کا بستر ہے جس پر راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے، جو اس تخت پر بٹھایا گیا گویا بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا (من وُلّی القضاء فقد ذبح بغیر سکین)، حکومت کا یہ تاج عظمت و کبریائی کا تاج نہیں ہے بلکہ ذمہ داریوں کا ایک پہاڑ ہے جسکی گرانی سے مضبوط سے مضبوط دماغ پاش پاش ہو جاتے ہیں، یہ خلیفۂ وقت قوم کا مخدوم اور مسجود نہیں ہے بلکہ اسکا خادم اور چاکر ہے، تو

اسکو سنکر قوم پرستوں اور وطن پرستوں نے جو کچھ کیا اس سے تم واقف ہو چکے ہو، لیکن یہ انقلابی تصورِ حکومت اسقدر عقل اور جذبات نفس سے اسقدر بلند تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لیجانیکے بعد اسلام کے اُن زبردست علمبرداروں نے بھی، جو جاہلیت کے ایک ایک نشان کو پاؤں تلے روند چکے تھے، اسکو پوری طرح سمجھنے سے اپنے آپ کو عاجز پایا، حتیٰ کہ اگر ابو بکر و عمر جیسے کامل مسلمان موجود نہ ہوتے تو صحابۂ کرام کی سی بہترین تربیت یافتہ جماعت بھی اس اعلیٰ و ارفع تصورِ حکومت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھی ہوتی۔ ثقیفۂ بنی ساعدہ میں خلافت کا مسئلہ پیش ہوتا ہے۔ مہاجرین اور انصار میں جماعتی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ ایک گروہ اس خیال میں ہے کہ یہ سلطنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوتِ بازو سے قائم کی ہے، لہذا آپکے قرابت داروں کے سوا وراثت اور جانشینی کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ دوسرا گروہ گردن موڑ کر عرب کے میدانوں اور صحراؤں کو دیکھتا ہے تو قریب قریب ہر جگہ اسے اپنے ہی نونہالوں اور جگر گوشوں کا مزار نظر آتا ہے، ہر سمت اسے اپنے ہی خون کی لالی دکھائی پڑتی ہے۔ اسوقت وہ اسلامی تصورِ صلاحیت و استحقاق سے بیگانہ ہو کر اپنی قربانیوں کا معاوضہ چاہتا ہے اور اپنے حق سے بڑھکر کسی کے حق کو ماننے کیلیے تیار نہیں ہوتا۔ دونوں گروہ اپنے اپنے نظریہ کے ماتحت سرگرم بحث ہیں، اور چونکہ دلائل دونوں جانب ایک ہی سے ہیں اس لیے آخر کار رفع نزاع کی خاطر انصار بول اٹھتے ہیں کہ منا امیر و منکم امیر یعنی ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم میں سے۔

اندازہ کرو اس قرآنی تصورِ خلافت کی بلندی کا! ایسے اربابِ بصیرت اور اخلاص پسند انسانوں کی فہم بھی تھوڑی دیر کیلیے وہاں تک پہنچنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔

مگر آسمانِ نبوت کے ماہ و پرویں ابھی موجود تھے۔ ان کے طلوع ہوتے ہی چند لمحوں میں حق کی روشنی چمک اٹھی، جاہلی وساوس کی گھٹا چھٹ کر رہ گئی، اسلامی تصور مجسم بنکر سامنے آگیا اور حق

پرستوں کی جماعت نے بالاتفاق اُسکے آگے سر تسلیم خم کردیا کہ وہ جس عالم میں بھٹک رہے تھے وہ غلط فہمی کا دھندلکا تھا نہ کہ نفس پرستی کا اندھیارا۔ نور علم آنے کے بعد جس شخص کو خلیفہ منتخب کیا گیا وہ نہ اوسی تھا، نہ خزرجی، نہ ہاشمی۔ یعنی یہ انتخاب نہ نسل کی سفارش پر ہوا، نہ وطن کی، نہ وراثت کی۔ اسکے انتخاب میں قربانیوں اور جاں نثاریوں کے معاوضہ کا بھی کوئی لحاظ نہ کیا گیا تھا۔ اسکو منتخب کیا گیا صرف اس لیے کہ وہ نبی کے بعد افضل البشر تھا، سب سے زیادہ پرہیزگار تھا، سب سے بڑھکر مخلص اور بے لوث تھا، سب سے بڑھکر اسلام کی روح اور شریعت کے مزاج کو سمجھنے والا تھا، اور نبی کی تعلیم و تربیت سے فیض یاب ہونے میں سب پر فوق لے گیا تھا۔

اسلام کا نظریۂ جنگ بھی ان شدید ترین انقلابی نظریات میں سے تھا جسے گرفت میں لانا انتہا درجہ کا مجاہدۂ نفس چاہتا تھا۔ تمام داعیات نفس، حتیٰ کہ نفسانی غضب اور عداوت تک کے جذبات سے پاک کرکے اسلام نے جس طرح لڑائی کو خالصتہً ایک اجتماعی خدمت بنا دیا، اسکی اخلاقی رفعت کا اندازہ اس واقعہ سے کرو کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ایک دشمن کے سینے پر سوار ہوکر قتل کیلیے تلوار کو حرکت دے چکے ہیں۔ اتنے میں بے بس دشمن آپ کے منہ پر تھوک دیتا ہے۔ آپ فوراً ہاتھ روک لیتے ہیں اور اس کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ آپ فرماتے ہیں کہ میں اللہ کیلیے تجھے قتل کر رہا تھا۔ جب تو نے مجھ پر تھوک دیا تو میرے نفس کا جذبۂ انتقام بھڑک اٹھا۔ اب اگر میں تجھے قتل کرتا تو میری نفسانیت بھی اس فعل میں شریک ہو جاتی ـــ اس تصور کی خالص اخلاقیت اور بے لوث عقلیت اتنی بلند تھی کہ اسکی رفعتوں تک پہنچنے میں ان لوگوں کو بھی ابتداءً بڑی دشواریاں پیش آئیں جو نفسانیت اور جاہلیت کو یکسر خیرباد کہہ چکے تھے۔ برسوں کی تعلیم و تربیت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انکو میدان جنگ میں لائے، اور باوجودیکہ انکی ذہنیت میں انقلاب عظیم رونما ہو چکا تھا، مگر پھر بھی اسلام کی ابتدائی لڑائیوں میں صحابۂ کرام۔ جہادِ

فی سبیل اللہ کی اصلی اسپرٹ کو سمجھنے میں بار بار غلطیاں کر جاتے تھے جنکی وجہ سے بعض غزوات میں اللہ تعالیٰ نے انکو مشرکین سے شکست بھی کھلوا دی، تاکہ وہ اپنی لغزشوں پر متنبہ ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، اس میں صدیوں کی روایات سے یہ تصور گہری جڑوں کیساتھ جما ہوا تھا کہ لڑائی یا تو مال و زر اور ملک و سلطنت کیلیے ہوتی ہے، یا پھر جذبۂ عداوت و انتقام کیلیے۔ اس تصور کو دل و دماغ کے ایک ایک ریشے سے نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ چنانچہ غزوات اسلام کی تاریخ پر غائر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار رسالتمآب کو جنگ کے متعلق صحابہ کا نقطۂ نظر درست کرنے میں کتنی محنت کرنی پڑی ہے۔

سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلعم سے پوچھا "یا رسول اللہ اس مجاہد کے متعلق کیا ارشاد ہے جو مالِ غنیمت کی طلب اپنے دل میں رکھتا ہے"، آپ نے فرمایا "اسکو آخرت میں کوئی اجر نہ ملے گا"۔ جب ان صحابی نے لوگوں تک یہ ارشاد پہنچایا تو وہ بے حد متعجب ہوئے، انہیں یقین نہ آیا کہ حضورؐ نے ایسا فرمایا ہوگا، اور بیان کرنیوالے کی سماعت کی تکذیب کرنے لگے۔ دوبارہ بھیجا کہ تم نے مطلب نہ سمجھا ہوگا جا کر از سرِ نو تحقیق کر آؤ۔ وہ جب دوبارہ اسی جواب کو لیکر لوٹے تو بھی لوگوں کا استعجاب کم نہ ہوا، جس چیز کو وہ بہترین ذریعہ معاش اور اعلیٰ ترین مقصد جنگ سمجھتے آئے تھے اسکے متعلق یہ فیصلہ ایسا عجیب بلکہ بداہت کے خلاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کی عقلیں بار بار اسے تسلیم کرنے سے ابا کرتی تھیں۔ آخر کار تیسری بار دریافت کرانے پر انھیں یقین آیا اور معلوم ہوا کہ اسلام کا تصور جنگ رغبات دنیوی اور جذبات نفس سے اس قدر پاک اور منزہ ہے۔ یہاں کا سودا (مادّی لحاظ سے) یک طرفہ ہے۔ محض سر دینا ہے خوں بہا لینا نہیں ہے۔ مال خرچ کرنا ہے مال حاصل کرنا نہیں ہے۔ یہاں شرط یہ ہے کہ حریف کی دشمنی تمہیں میدان میں نہ لے جائے بلکہ اسکی اور سارے عالم کائنات کی ہمدردی کیلیے جاؤ تاکہ جہلا اپنی نادانی کی بنا پر مرکز عدل کو ہٹا کر میزان قسط

کو پامال کرکے، اور خدا کی زمین میں شر و فساد برپا کر کے اپنے اوپر ظلم کرنے اور اپنی دنیا و آخرت برباد کرنے سے باز آجائیں، یعنی دراصل تم ظالموں کی مدد کرتے ہو، نہ کہ مخاصمت اور دشمنی۔ عرصۂ کارزار دنیا کمانیکی جگہ نہیں ہے۔ ایک مقدس ترین عبادت کی جگہ ہے جہاں لوگ قتل نہیں کیے جاتے، انسانیت زندہ کی جاتی ہے۔

جہاد کی اسی حقیقت کو جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمایا "اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم"، تو صحابۂ کرام کی حقیقت شناس نگاہیں بھی اس رمز کو نہ پاسکیں اور انہوں نے متعجب ہو کر پوچھا "مظلوم کی اعانت تو ہوسکتی ہے مگر ظالم کی اعانت کیونکر ممکن ہے؟" آپ نے فرمایا "ظالم کی اعانت یہ ہے کہ اسے ظلم سے روک دو۔"

ایک موقع پر جب شارع علیہ السلام نے اسی تصویر کے دوسرے رخ کو پیش کیا اور فرمایا:

اِذَا الْتَقَی الْمُسْلِمَانِ بِسَیْفِہِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ کِلَاھُمَا فِی النَّارِ

"جب دو مسلمان تلواریں لیکر آپس میں لڑ پڑیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہونگے"۔

تو جس طرح تصویر کے پہلے رخ نے حیرت میں ڈال دیا تھا یہ دوسرا رخ بھی بالکل نرالا اور تعجب خیز معلوم ہوا، صحابہ کرام نے متحیر ہو کر پوچھا:

ھٰذَا الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ الْمَقْتُوْلِ؟ ایک تو خیر قاتل تھا اور قتل کرنیکی پاداش میں جہنمی ہوا) لیکن مقتول کی کیا خطا ہے؟

جواب ملا:

اِنَّہٗ کَانَ حَرِیْصًا عَلٰی قَتْلِ صَاحِبِہٖ "(اس کی وجہ یہ ہے کہ) وہ بھی اپنے مقابل کو قتل کرنا چاہتا تھا"۔ یعنی صرف اتنا ہی نہ دیکھو کہ وہ مقتول اور مظلوم ہے بلکہ یہ بھی دیکھو کہ کس چیز

نے اس سے تلوار اٹھوائی تھی؟ کیا محض اسکی ذاتی منافرت اور جاہلی حمیت کی تحریک نہ تھی؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اسلام کی نگاہ میں کسی نفسانی غرض اور حمیت کے ماتحت تلوار اٹھانا کس قدر مبغوض ہے؟ خصوصاً جس قطرۂ خون کو اسلام کی حرمت حاصل ہے اسے بغیر کسی حق کے بہانا یا بہانے کی نیت کرنا بدترین معصیت ہے، حتیٰ کہ اگر تمہاری تلوار کسی دشمن کا فر پر کھنچ چکی ہو اور وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ پڑھ دے تو پھر تمہیں اپنی تلوار کو ایک انچ بھی آگے بڑھانے کا مجاز نہیں، کہ اب وہاں سے جاہلیت کی حد شروع ہو جاتی ہے۔

چنانچہ حضرت خالدؓ کو یہی مشکل پیش آئی تھی۔ انہوں نے دوران جنگ میں ایک دشمن پر وار کیا اس نے فوراً کلمۂ طیبہ پڑھ دیا مگر آپ نے ہاتھ روکا نہیں اور اسکا کام تمام کر دیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اصل واقعہ کی جب خبر ہوئی تو آپ نے بازپرس کی۔ حضرت خالد نے فرمایا یا رسول اللہ اس نے محض موت کے ڈر سے ایسا کیا تھا، پھر اس سے محاربانہ سلوک کرنے میں کیا زحمت تھی؟ آپ نے فرمایا کیا تم نے اسکا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟ تمہیں کیا معلوم کہ جو اسکی زبان سے نکلا اس کے دل میں نہ تھا۔ اگر وہ ایمان لا چکا تھا تو پھر تم نے کس حق کی بنا پر اس کا خون بہانا روا رکھا؟

گویا یہ ایک ذرا سا وہم بھی اسلامی جنگ کے رخ کو پھیر دیتا ہے، اور اسلام کی عاقلانہ ذہنیت کسی خفیف سے خفیف غیر اسلامی جذبہ کی شرکت بھی گوارا نہیں کر سکتی، اور اس معاملہ میں اس قدر نفس کے میلانات سے متنفر ہے کہ حضرت خالدؓ جیسے صاحب فہم انسان کو بھی اس کے حدود کی تمیز مشکل ہو گئی۔

اسلامی مساوات کا نظری پہلو اس قدر واضح تھا کہ صحابۂ کرام نے نہایت آسانی سے اسے قبول کر کے اپنے طریقہ معاشرت کو اس کے سانچے میں ڈھال دیا، اور جبکہ دنیا نے سیادت و حکومت حسب نسب، اور مال و زر کے صدہا امتیازات قائم کر رکھے تھے، انہوں نے پردیسیوں کو امامت

دی، غلاموں کو سپہ سالاری بخشی، انکی شتربانی کی اور فخرِ نسب اور غرورِ مال کے سارے بتوں کو توڑ کر شرف و مجد کا معیار صرف تقویٰ اور طہارت پر رکھا۔ تاہم بعض حضرات کبھی کبھی قدیم تصورات کے استیلاء پر اس نظریہ کو فراموش بھی کر بیٹھتے تھے لیکن آنحضرتؐ اس پر سخت تنبیہ فرماتے تھے۔ ایک بار حضرت ابوذر غفاری نے جوشِ غضب میں اپنے غلام کو کچھ ناروا کلمات کہدیئے۔ رحمتہ للعالمین نے سنا تو برافروختہ ہو کر فرمایا "انک امرؤ فیک جاہلیۃ"۔ ابوذر! تمہارے اندر ابھی تک جاہلیت کا فاسد مادہ موجود ہے!

ایک بڑے خاندان کی عورت نے چوری کی، بارگاہِ رسالت نے حکم دیا کہ اسکے ہاتھ کاٹ لیے جائیں۔ خاندانی عظمت کا سویا ہوا تصور دماغوں میں جاگ اٹھا۔ لوگوں نے حضرت زیدؓ سے سفارش کرائی کہ ایک صاحب حسب عورت کی یہ توہین نہ کی جائے۔ چہرۂ مبارک فرطِ غیظ سے متغیر ہو گیا اور آپ نے نہایت غضبناک لہجہ میں فرمایا "کیا تم مجھ سے حدود اللہ کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ اسی چیز نے پچھلی قوموں کو ہلاک کیا۔ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی غریب و بیکس اسی جرم کا ارتکاب کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ خدا کی قسم اگر فاطمہؓ بنتِ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی چوری کرے تو میں اسکا بھی ہاتھ کٹوا دونگا"

حضرت قدامہؓ بن مظعون ایک جلیل القدر صحابی اور حضرت عمرؓ کے سالے تھے۔ انہوں نے شراب پی اور خود فاروق اعظم نے قرابت اور جلالتِ شان کا کوئی لحاظ کیے بغیر ان پر حد جاری کرنی چاہی تو لوگوں میں پھر وہی امتیازِ نسلی کا غیر اسلامی تصور آموجود ہوا، اور حضرت عمر کی مخالفت ہونے لگی۔ لیکن وہ امرِ حق میں تیغ دودم تھے۔ انہوں نے فوراً اس وسوسۂ جاہلی کو دلوں سے نکالتے ہوئے فرمایا "مجھے انکا کوڑوں کے نیچے مرجانا منظور ہے مگر خدا کے حضور میں حدود الٰہی کے توڑنے کا بار لیکر جانا گوارا نہیں، جلد ایک مضبوط کوڑا لے آؤ"

ایک دن سرداران قریش میں سے حضرت ابوسفیانؓ ابن حرب اور حضرت حارثؓ بن ہشام وغیرہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مگر وہاں سب سے پہلے اہل بدر کو جن میں حضرت صہیبؓ رومی، حضرت بلالؓ حبشی اور حضرت عمارؓ بھی تھے شرفِ باریابی بخشا گیا۔ حضرت ابوسفیانؓ جنھوں نے ابھی کل تک بڑے بڑے جبابرۂ مکہ کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکتے دیکھا تھا، اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکے۔ ان سے اپنے رئیسانہ افتخار کی یہ پامالی دیکھی نہ گئی۔ انہوں نے نہایت چیں بجبیں ہوکر فرمایا کیا قیامت ہے! ان ناچیز غلاموں کو اذن ملتا ہے اور ہم بیٹھے منہ تکتے ہیں۔ ہمارے مراتب کی یہ تحقیر! ان کا دماغ اس وقت اسلامی تصور فضل و کرامت کی اونچائیوں سے بہت نیچے اتر آیا تھا۔ وہ بھول بیٹھے تھے کہ یہ اسلام کا دربار ہے۔ یہاں عزت و عظمت کے نظریات جاہ دینوی اور علوِ نسبی سے نہیں اخذ کیے جاتے۔ یہاں انسانی فضل و کمال طاعت الٰہی کی میزان میں تولا جاتا ہے، رنگ و نسل کے بلڑوں میں نہیں۔ آخر کار حضرت سہیل ابنِ عمروؓ نے جو ساتھ باہر کھڑے تھے سمجھایا کہ یہ موقع حسرت کا ہے غضب کا نہیں۔ اسلام نے سب کے ساتھ تمھیں بھی اس نعمت کی طرف بلایا تھا، مگر تمہاری بدبختی نے تمہیں پیچھے ڈال دیا اور یہ لوگ آگے بڑھ گئے۔

اسلامی مساوات کا ایک پہلو انزلوا الناس علیٰ منازلھم (یعنی لوگوں کو انکی حیثیت کے مطابق جگہ دو) کا بھی ہے کیونکہ اسلام کے قوانین اور نظریات میں افراط تفریط نہیں، سراسر عدل اور میانہ روی ہے۔ یہ پہلو ذرا زیادہ غامض تھا جس تک دور رس صحابہ ہی کی نگاہیں پہنچتی تھیں۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق حضرت عائشہؓ نے ایک فقیر کو روٹی کا ایک ٹکڑا دیکر رخصت کر دیا، لیکن تھوڑی دیر بعد ایک مہذب اور خوش پوشاک انسان آیا تو اسے بٹھا کر نہایت عزت و احترام سے کھانا کھلایا۔ لوگوں کو بظاہر اس تفریق پر استعجاب ہوا تو حضرت عائشہؓ صدیقہ نے مذکورۂ بالا فرمان رسالت سنا دیا۔ اس وقت ان کی سمجھ میں آیا کہ حدود اور قوانین ملکی جیسی مساوات، عام آداب معاشرت

ہیں قائم کرنا حکمت اور دور اندیشی کے خلاف ہے - ہر انسان کے منتہائے نظر اور دماغی پرواز کے مطابق اس سے سلوک کرنا چاہیے -

اسلام نے اپنی ہیئت اجتماعیہ کی بنا رنگ و نسل اور ملک و وطن کے بجائے محض افکار اور عقائد کی یکسانی و ہم آہنگی پر رکھی تھی - اس نے بھائی سے بھائی پر تلوار اٹھوائی اس لیے کہ ایک حزب اللہ کا رکن تھا لیکن دوسرا اس کا باغی تھا - اس نے قریشی کو حبشی سے گلے ملایا اس لیے کہ دونوں کا تصور حیات اور نظام زندگی ایک تھا - اُس نے مکہ والوں کو لاکر اوس اور خزرج کا ہم قوم قرار دیا اور خود مکیوں اور یثربیوں کے اپنے اعزہ و اقارب کو غیر ٹھیرا دیا، اس لیے کہ مسلمانوں اور انکے کافر عزیزوں میں اگرچہ خون کا رشتہ تھا، وطن کا رشتہ تھا، نسل کا رشتہ تھا، مگر لا الٰہ الا اللہ کا وہ اصلی اور لازوال رشتۂ روحانی نہ تھا جس پر یہ سارے مادّی اور خود غرضانہ رشتے قربان ہوجاتے ہیں - چنانچہ دنیا کی تاریخ میں جو انقلاب سب سے بڑا، سب سے عظیم الشان اور سب سے زیادہ محیر العقول کہا جا سکتا ہے وہ یہی اسلامی قومیت اور نظم اجتماعی کا انقلاب تھا، جس نے نسل، رنگ، زبان، اور جغرافیہ کی مقراضوں سے کٹی ہوئی انسانیت کو ربط و تعلق کی ایک ایسی عقلی بنیاد فراہم کردی جس پر تمام نوع انسانی متحد ہو سکتی ہے، جس نے پہاڑوں اور دریاؤں کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ وہ انسان کو انسان سے کاٹ دیں، جس نے کھال کے رنگ، اور نطفہ کے خصائص، اور زبان کی چال ڈھال کو بھی یہ اقتدار دینے سے انکار کردیا کہ وہ انسان اور انسان کے درمیان حائل ہوجائیں - اس نے جاہلیت کے تمام شیرازوں کو توڑ کر صرف ایک شیرازۂ ایمان کو قومیت کی اساس اور علت جامعہ قرار دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاجرین اور انصار، جن کا قومی آن اور وطنی تعصب پر مرمٹنا اولین مقصد زندگی تھا، باہم حقیقی بھائیوں کی طرح گھل مل گئے -

جس وقت اسلام یہ انقلاب برپا کر رہا تھا، جاہلیت بھی اس وقت خاموش نہ تھی۔ اس نے ہاتھوں سے نکلتے ہوئے میدان کو دانتوں سے پکڑنے کی کوشش کی، اور قدم قدم پر انقلاب اسلامی کے سیلاب کا مقابلہ کیا۔ ایک طرف اسلام نسل آدم کے بکھرے ہوئے اجزاء کو دین اور تہذیب کے رشتے میں جوڑ رہا تھا، اور دوسری طرف جاہلیت اپنی انہی پرانی مقراضوں سے اس پر حملہ کرنے کیلیے مستعد تھی۔ صحابۂ کرام ایک مدت تک اس کشمکش میں مبتلا رہے، بارہا ایسا ہوا کہ منافقین کی مفسدہ پردازیوں اور خفیہ ریشہ دوانیوں نے عصبیت کے غیر اسلامی جذبات کو بھڑکا دیا اور دفعتہً وطنی و نسلی تعصب، برقی رو کی طرح جسم کے رگ و ریشہ میں دوڑ گیا۔ غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر ایک مہاجر نے کسی انصاری کو تھپیڑ مار دیا۔ اس نے اپنا قومی نعرہ لگایا۔ چشم زدن میں طرفین سے تلواریں کھنچ گئیں اور تھوڑی دیر کیلیے اسلامی مواخات اور تصور قومیت سے دل و دماغ بغاوت کر بیٹھے۔ ایک مرتبہ اوس و خزرج، دونوں قبیلوں کے بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے باہم گفتگو کر رہے تھے۔ یہودی شر انگیزوں کا ایک گروہ پہنچا کہ کسی طرح جاہلی تصورات کو ابھار کر ان دونوں قبیلوں کی پرانی عداوتوں کو تازہ کر دیا جائے کیونکہ انھیں کے اتحاد پر اسلامی شوکت اور قوت کا دار و مدار تھا۔ چنانچہ جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا، جس میں یہ دونوں قبیلے لڑ کر قریب قریب فنا ہو گئے تھے۔ عصبیت کی دبی ہوئی چنگاریاں شعلہ بنکر بھڑک اٹھیں اور قریب تھا کہ انقلاب معکوس (counter revolution) برپا ہو جاتا لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم آموجود ہوئے اور وعظ و تذکیر کے ذریعہ اس فتنہ کو بجھا دیا۔

واقعۂ افک کے سلسلے میں جب آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ کون ہے جو اس مفتری سے ہمارا انتقام لے جس نے مجھے ایسی ایذا دی ہے؟ حضرت سعدؓ بن معاذ نے اٹھکر فرمایا کہ میں حاضر ہوں اگر وہ مفتری میرے قبیلہ (اوس) کا ہے تو بتایئے میں اسکی گردن مار دوں، اور اگر خزرجی ہے تو

بھی آپ کے حکم کی تعمیل کرونگا - خزرج کے سردار حضرت سعدؓ بن عبادہ کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی - انہوں نے اسے اپنی قومی عزت اور شان پر حملہ خیال کیا، قبائلی عصبیت نے جوش مارا اور اسلامی تصور قومیت پر چھا گئی - انہوں نے فوراً بھڑک کر کہا کہ خزرج کے آدمی کو مارنے والے تم کون ہوتے ہو؟ بات بڑھی اور اگر سرکار رسالتمآبؐ موجود نہ ہوتے تو شاید اسلامی قومیت اور اخوت کی لاش اسی وقت خون کے دھارے میں تیرتی نظر آتی -

اس قسم کے بکثرت واقعات اس انقلاب کی ابتدائی تاریخ میں ملتے ہیں، جنکو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام و جاہلیت کے اس معرکہ میں صحابۂ کرام کی سی خالص و مخلص جماعت کو بھی کیسی سخت زحمتوں سے دوچار ہونا پڑا، اور کس قدر سخت جدوجہد کے بعد نبیٔ اکرم نے وہ انقلابی سوسائٹی بنائی جسکی رگ رگ سے جاہلیت نکال دی گئی تھی -

انسان کے ذاتی جذبات قومی اور خاندانی جذبات سے کہیں زیادہ عزیمت شکن اور بے پناہ ہوتے ہیں - جب عزت اور حمیت کا طوفان جوش مارتا ہے تو بڑے سے بڑے ارباب عزم و متانت کے پاؤں بھی اسکی رو میں اکھڑ جاتے ہیں - نفس کا یہ سب سے کامیاب اور خطرناک وار ہے جسے رد کرنیکے لیے نبوت کا استقلال چاہیے - اسلام کی بلند نظری اور حق پسندی یہاں اپنے انتہائی کمال پر پہنچ جاتی ہے - اگرچہ غیرت انسانیت کا ایک بہترین جوہر ہے، لیکن اسلام اسے بھی آزاد نہیں چھوڑتا، اسے بھی اپنا تابع بناتا ہے، اسے اعتدال کے حدود سے باہر نہیں جانے دیتا، اور انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ کبھی نفس کے رجحانات سے مغلوب نہ ہو - جو کچھ کرے اور جو کچھ کہے، نفسانیت اور جذبات سے عاری ہوکر، محض خدا کے لیے، اسکی رضاجوئی کیلیے اور اسکے نظام عدل کی برقراری کیلیے - اسلام کا یہ نازک ترین مطالبہ ہے، اور یہ اتنا نازک ہے کہ ایک مرتبہ صدیق اکبرؓ جیسے بے نفس، متورع اور سراپا للّٰہیت انسان بھی اسکو پورا کرنے سے چوک گیا - واقعۂ افک

ایسا شدید سانحہ تھا جس سے بڑھکر انسان کیلیے جانگسل اور روح فرسا ابتلا ممکن ہی نہیں۔ جس باپ کی عفت مآب بیٹی پر جھوٹا الزام لگے اسکی جراحت دل کا حال کسی باپ ہی سے پوچھو۔ یہی زخم صدیق اکبر کے دل پر لگا تھا۔ اس زخم پر نمک چھڑکنے والوں میں ایک صاحب (مسطحؓ بن اثاثہ) بھی ناسمجھی سے شریک ہو گئے تھے جو نہ صرف حضرت صدیقؓ کے قریبی رشتہ دار تھے، بلکہ آپ کے پروردہ بھی تھے۔ صدیق اکبرؓ کا اس پر رنجیدہ ہونا بشریت کا طبعی اقتضا تھا، چنانچہ آپ نے قسم کھالی کہ آئندہ سے اس شخص کی کفالت نہ کرونگا۔ مگر اسلام ایک سچے انسان کو جس مقام فضل و احسان پر دیکھنا چاہتا ہے، یہ مقام غیظ و انتقام اس سے فروتر تھا۔ فوراً تنبیہ ہوئی کہ:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

تم میں سے بڑے اور صاحب مقدرت لوگ قرابت داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو مدد نہ دینے کی قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ انھیں معاف کر دیں اور ان سے درگذر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں بخشدے اور اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (نور - ۳)

غور کرو مسطحؓ نے کیسا شنیع جرم کیا تھا؟ اپنے محسن اور سرپرست کے کلیجے پر کیسا سخت تیر مارا تھا؟ اور اس کی پاداش میں اس پیکر صبر و تحمل نے کتنا خفیف اقدام کیا تھا؟ مگر اسلام کی روح اس خفیف ترین بیگانے جذبہ سے بھی کس طرح مضطرب ہو جاتی ہے؟ اسکا معیار فضیلت اتنی سی غیر اسلامی حمیت کو بھی برداشت نہیں کرتا۔

لڑائی کا میدان انسانیت کا مذبح مانا جاتا ہے۔ لیکن اسلام کا میدانِ جہاد حیات انسانیت کا سرچشمہ ہے۔ شہید ہونے والا مرنے کے بجائے زندہ ہوتا اور بہتوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ دنیا کے خیال

ہیں لڑائیاں اسباب معیشت کی بربادی اور نسل انسانی کی ہلاکت ہیں۔ لیکن اسلام کہتا ہے کہ جہاد میں خرچ کرنے سے گریز کرنا ہی اصل ہلاکت اور نامرادی ہے۔ یہاں تم جتنا زیادہ خرچ کرو گے اس سے زیادہ رزاقِ عالم تمہیں دیگا۔ خدا نے تم پر اپنا کلمہ بلند کرنیکی فرضیت عائد کی ہے، اور رزق بھی اسی کا دیا ہوا ہے۔ لہذا اسکے عطا کردہ رزق کو اسی کی راہ میں صرف کرنے سے جی چرانا کفرانِ نعمت ہے۔ یہ انسان کی نادانی اور دنیا پرستی ہے کہ وہ انفاق فی سبیل اللہ کو مال و اسباب کی اضاعت سمجھتا ہے۔

بعض انصار کو یہی غلط فہمی پیش آئی تھی۔ جب اسلام خوف و ہراس کی چہار دیواریوں سے نکل کر عزت اور توانائی کے کھلے میدان میں آ کھڑا ہوا اور اعوان و انصار کی کثرت ہوگئی تو بعض لوگوں نے کہا اب اسلام کا دائرۂ اقتدار مدینہ سے باہر تک وسیع ہو چکا ہے۔ حواریوں کی اب کمی نہیں رہی۔ اس لیے ہمیں اپنی جائداد کی اصلاح و توسیع کی فکر کرنی چاہیے کیونکہ مسلسل غزوات نے ہمارا معاشی نظام پارہ پارہ کر ڈالا ہے، مال کی قربانیاں دیتے دیتے ہم چور چور ہو گئے ہیں، اور ہلاکت و ناداری کے کنارے آ لگے ہیں۔ پروردگار عالم نے اس غیر اسلامی وہم کی فوراً تردید کی اور فرمایا:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اور (انفاق سے رک کر) اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ (یعنی انفاق فی سبیل اللہ ہلاکت نہیں ہے بلکہ اس سے رک جانا اور معاش کی فکر میں لگ جانا اصل ہلاکت اور خسران ہے)۔

اس تفصیل سے یہ اندازہ کرنا مقصود تھا کہ اسلام کا تصور حیات، اسکا نظریۂ مذہب، اسکے اصول اخلاق، اسکے مناہج تمدن و سیاست، اور اسکے مقاصد صلح و جنگ کیسے انقلابی

ستھے، اور نفسانیت، روایتی افکار اور موروثی رسوم ورواج سے الگ کرکے انکی بنا کیسی خالص عقلیت پر رکھی گئی تھی کہ نہ صرف جاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹکنے والوں نے اس سے وحشت اور بیگانگی محسوس کی، بلکہ جن کی عقل اور فطرت سے یہ تاریکیاں چھٹ چکی تھیں اور جن میں فہم و بصیرت کا نور چمک اٹھا تھا انھیں بھی ان بلندیوں کے سامنے بار بار حیرت سے ٹھٹک جانا پڑا، اور انکے ہادی (علیہ السلام) نے کتنی مشکلوں کے بعد اس بلندی پر پہنچا کر انھیں اس "غریب" اسلام سے مانوس کیا۔ (باقی)

بچوں کیلئے مفید کتابیں

سراپائے رسول اس مختصر کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیۂ مبارک اور آپ کے عادات وخصائل لباس، معاشرت، اخلاق آداب واطوار اور عام طرز زندگی کے متعلق تمام معلومات جمع کی گئی ہیں، اور انکو بہت سہل زبان اور دلکش اندازِ بیان میں لکھا گیا ہے جیبی تقطیع پر بہت خوبصورت طبع ہوئی ہے۔ قیمت ۴ر

ہمارے نبی کے صحابہ اس کتاب میں صحابہ کرام کی زندگی کے سبق آموز واقعات نہایت سلیس زبان اور دلنشین انداز بیان کیساتھ درج کیے گئے ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ بزرگوں کے اخلاق، دینداری، حسنِ معاشرت اور نیک معاملات کا حال معلوم ہوتا ہے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا شوق پیدا ہوتا ہے قیمت قسم اول ۸ر قسم دوم ۱۰ر۔ علاوہ محصول ڈاک

مسلمان بیبیاں یہ کتاب "ہمارے نبی کے صحابہ" کی طرح صحابیہ خواتین کے حالات پر مشتمل ہے جسمیں ان پاک ہستیوں کی زندگی کو مسلمان لڑکیوں کیلیے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ زبان اسقدر سادہ ہے کہ کم سن بچیاں بآسانی اسکو سمجھ سکتی ہیں قیمت ۸ر علاوہ محصولڈاک

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے

خطبات جمعہ

خطبۂ اولیٰ - ۲۵ / ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۷ھ

حمد و صلوٰۃ کے بعد :-

برادران اسلام! مذہب کی باتوں میں آپ اکثر دو لفظ سنا کرتے ہیں، اور بولتے بھی ہیں - ایک دین - دوسرے شریعت - لیکن آپ میں سے بہت کم آدمی ہیں جنکو یہ معلوم ہوگا کہ دین کے کیا معنی ہیں اور شریعت کا کیا مطلب ہے - بے پڑھے لکھے تو خیر مجبور ہیں - اچھے خاصے تعلیم یافتہ آدمی، بلکہ بہت سے مولوی بھی یہ نہیں جانتے کہ ان دونوں لفظوں کا ٹھیک ٹھیک مطلب کیا ہے، اور ان دونوں میں فرق کیا ہے - اس ناواقفیت کی وجہ سے اکثر دین کو شریعت سے اور شریعت کو دین سے گڈمڈ کر دیا جاتا ہے، اور اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں - آج میں بہت سادہ الفاظ میں آپ کو ان کا مطلب سمجھاتا ہوں -

دین کے کئی معنی ہیں - ایک معنی عزت، حکومت، سلطنت، پادشاہی اور فرمانروائی کے ہیں - دوسرے معنی اسکے بالکل برعکس ہیں، یعنی ذلت، اطاعت، غلامی، تابعداری اور بندگی - تیسرے معنی حساب کرنے، اور فیصلہ کرنے، اور اعمال کی جزا و سزا دینے کے ہیں -

قرآن شریف میں لفظِ دین انہی تین معنوں میں آیا ہے - فرمایا :

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ -

یعنی خدا کے نزدیک دین بس وہی ہے جس میں انسان صرف اللہ کو عزت والا مانے، اور

اور اس کے سوا کسی کے آگے اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے۔ صرف اللہ کو آقا اور مالک اور سلطان سمجھے اور اس کے سوا کسی کا غلام، فرمانبردار اور تابعدار بنکر نہ رہے۔ صرف اللہ کو حساب کرنے اور جزا و سزا دینے والا سمجھے، اور اس کے سوا کسی کے حساب سے نہ ڈرے، کسی کی جزا کا لالچ نہ کرے اور کسی کی سزا کا خوف نہ کھائے۔ اسی دین کا نام "اسلام" ہے۔ اگر اس کو چھوڑ کر آدمی نے کسی اور کو اصلی عزت والا، اصلی حاکم، اصلی بادشاہ اور مالک، اصلی جزا و سزا دینے والا سمجھا اور اسکے سامنے ذلت سے سر جھکایا، اس کی بندگی اور غلامی کی، اس کا حکم مانا، اور اس کی جزا کا لالچ اور سزا کا خوف کھایا، تو یہ جھوٹا دین ہوگا، اللہ ایسے دین کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ یہ حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ خدا کے سوا کوئی دوسری ہستی اس تمام کائنات میں اصلی عزت والی نہیں ہے، نہ کسی اور کی سلطنت اور بادشاہی ہے، نہ کسی اور کی غلامی اور بندگی کیلیے انسان پیدا کیا گیا ہے، نہ اس مالک حقیقی کے سوا کوئی اور جزا و سزا دینے والا ہے۔ یہی بات دوسری آیتوں میں اس طرح بیان فرمائی گئی ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔

یعنی جو شخص خدا کی سلطنت اور بادشاہی کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا مالک اور حاکم مانیگا اور اسکی بندگی اور غلامی اختیار کریگا، اور اس کو جزا و سزا دینے والا سمجھے گا، اس کے دین کو خدا ہرگز قبول کرنے والا نہیں ہے۔ اسلیے کہ

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ

انسانوں کو تو خدا نے اپنا بندہ بنایا ہے، اور اپنے سوا کسی اور کی بندگی کا حکم ہی نہیں دیا ہے ان کا تو فرض یہ ہے کہ سب طرف سے منہ موڑ کر صرف اللہ کے لیے اپنے دین، یعنی اپنی اطاعت اور غلامی کو مخصوص کر دیں، اور یکسو ہو کر صرف اسی کی بندگی کریں، اور صرف اسی کے حساب سے ڈریں۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّ

اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ -

کیا انسان خدا کے سوا کسی اور کی غلامی اور فرمانبرداری کرنا چاہتا ہے، حالانکہ زمین اور آسمان کی ساری چیزیں صرف خدا کی غلام اور فرمانبردار ہیں، اور ان ساری چیزوں کو اپنے حساب کتاب کے لیے خدا کے سوا کسی اور کی طرف نہیں جانا ہے؟ کیا انسان زمین اور آسمان کی ساری کائنات کے خلاف ایک نرالا راستہ اپنے لیے نکالنا چاہتا ہے؟

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ -

اللہ نے اپنے رسول کو سچے دین کا علم دے کر اسی لیے بھیجا ہے کہ وہ سارے جھوٹے خداؤں کی خدائی ختم کر دے، اور انسان کو ایسا آزاد کرے کہ وہ خداوندِ عالم کے سوا کسی کا بندہ بنکر نہ رہے، چاہے کفار و مشرکین اس پر اپنی جہالت سے کتنی ہی واویلا مچائیں، اور کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں -

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ

اور تم جنگ کرو اس لیے کہ دنیا سے غیر اللہ کی فرمانروائی کا فتنہ مٹ جائے، اور دنیا میں بس خدا ہی کا قانون چلے، خدا ہی کی پادشاہی تسلیم کی جائے، اور انسان صرف اسی کی بندگی کرے -

اس تشریح سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ دین کے معنی ہیں:

خدا کو آقا اور مالک اور حاکم ماننا -

خدا ہی کی غلامی، بندگی اور تابعداری کرنا -

اور خدا کے حساب سے ڈرنا، اسکی سزا کا خوف کھانا، اور اسی کی جزا کا لالچ کرنا -

پھر چونکہ خدا کا حکم انسان کو اسکی کتاب اور اسکے رسول کے ذریعہ ہی سے پہنچتا ہے، اسلیے

رسول کو خدا کا رسول اور کتاب کو خدا کی کتاب ماننا اور اسکی اطاعت کرنا بھی دین ہی میں داخل ہے جیسا کہ فرمایا :

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ -

یعنی اے بنی آدم، جب میرے رسول تمہارے پاس میرے احکام لیکر آئیں تو جو شخص تم میں سے ان احکام کو مان کر پرہیزگاری اختیار کریگا اور انکے مطابق اپنے عمل درست کریگا اسکے لیے ڈر اور رنج کی کوئی بات نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست ہر انسان کے پاس اپنے احکام نہیں بھیجتا بلکہ اپنے رسولوں کے واسطے سے بھیجتا ہے، اسلیے جو شخص اللہ کو حاکم مانتا ہو، وہ اسکی فرمانبرداری صرف اسی طرح کر سکتا ہے کہ اسکے رسول کی فرمانبرداری کرے، اور رسول کے ذریعہ سے جو احکام آئیں، ان کی اطاعت کرے۔ اسی کا نام دین ہے۔

اب میں آپ کو بتاؤنگا کہ شریعت کسے کہتے ہیں۔ شریعت کے معنی طریقے اور راستے کے ہیں جب تم نے خدا کو حاکم مان لیا، اور اسکی بندگی قبول کر لی، اور یہ تسلیم کر لیا کہ رسول اسی کی طرف سے حاکم مجاز ہے، اور کتاب اسی کی طرف سے ہے، تو تم دین میں داخل ہو گئے۔ اسکے بعد تم جس طریقے سے خدا کی بندگی کرو گے، اور اسکی فرمانبرداری میں جس راستہ پر چلو گے اسکا نام شریعت ہے۔ یہ طریقہ اور یہ راستہ بھی خدا اپنے رسول ہی کے ذریعہ سے بتاتا ہے۔ وہی یہ سکھاتا ہے کہ اپنے مالک کی عبادت اس طرح کرو، طہارت اور پاکیزگی کا یہ طریقہ ہے، نیکی اور تقویٰ کا یہ راستہ ہے، حقوق اس طرح ادا کرنے چاہئیں، معاملات یوں انجام دینے چاہئیں، اور زندگی اس طرح بسر کرنی چاہیے لیکن فرق یہ ہے کہ دین ہمیشہ سے ایک تھا، ایک ہی رہا اور اب بھی ایک ہی ہے۔ مگر شریعتیں بہت

سی آئیں، بہت سی منسوخ ہوئیں، بہت سی بدل گئیں، اور کبھی ان کے بدلنے سے دین نہیں بدلا۔ حضرت نوح کا دین بھی وہی تھا جو حضرت ابراہیم کا تھا، حضرت موسیٰ کا تھا، حضرت شعیب، اور حضرت صالح، اور حضرت ہود کا تھا، اور حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ مگر شریعتیں ان سب کی کچھ نہ کچھ مختلف رہی ہیں۔ نماز اور روزے کے طریقے کسی میں کچھ تھے اور کسی میں کچھ۔ حرام اور حلال کے احکام، طہارت کے قاعدے، نکاح اور طلاق اور وراثت کے قانون ہر شریعت میں دوسری شریعت سے کچھ نہ کچھ مختلف رہے ہیں۔ ان کے باوجود سب مسلمان تھے۔ حضرت نوح کے پیرو بھی حضرت ابراہیم کے پیرو بھی، حضرت موسیٰ کے پیرو بھی، اور ہم بھی۔ اسلیے کہ دین سب کا ایک ہے اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کے احکام میں فرق ہونے سے دین میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دین ایک ہی رہتا ہے، چاہے اُس پر عمل کرنے کے طریقے مختلف ہوں۔

اس فرق کو یوں سمجھو کہ ایک آقا کے بہت سے نوکر ہیں۔ جو شخص اس کو آقا ہی نہیں مانتا، اور اس کے حکم کو اپنے لیے واجب التعمیل ہی نہیں سمجھتا، وہ تو نافرمان ہے اور نوکری کے دائرے ہی سے خارج ہے۔ اور جو لوگ اسکو آقا تسلیم کرتے ہیں، اسکے حکم کو ماننا اپنا فرض جانتے ہیں، اور اسکی نافرمانی سے ڈرتے ہیں وہ سب نوکروں کے زمرے میں داخل ہیں۔ نوکری بجالانے اور خدمت کرنیکے طریقے مختلف ہوں تو اس سے ان کے نوکر ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر آقا نے کسی کو نوکری کا ایک طریقہ بتایا ہے اور دوسرے کو دوسرا طریقہ، تو ایک نوکر کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ میں نوکر ہوں اور وہ نوکر نہیں ہے۔ اسی طرح اگر آقا کا حکم سن کر ایک نوکر اسکا منشا کچھ سمجھتا ہے، اور دوسرا کچھ اور، اور دونوں اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں، تو نوکری میں دونوں برابر ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک نے مطلب سمجھنے میں غلطی کی ہو، اور دوسرے نے صحیح مطلب سمجھا ہو۔ لیکن جب اطاعت دونوں نے کی ہے، تو ایک کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ تو نافرمان ہے، یا تجھے آقا کی نوکری

ہی سے خارج کر دیا گیا۔

اس مثال سے آپ دین اور شریعت کے فرق کو بڑی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ تعالیٰ مختلف رسولوں کے ذریعہ سے مختلف شریعتیں بھیجتا رہا۔ کسی کو نوکری کا ایک طریقہ بتایا اور کسی کو دوسرا طریقہ۔ ان سب طریقوں کے مطابق جن جن لوگوں نے مالک کی اطاعت کی وہ سب مسلمان تھے، اگرچہ انکی نوکری کے طریقے مختلف تھے۔ پھر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آقا نے حکم دیا کہ اب پچھلے طریقوں کو ہم منسوخ کرتے ہیں۔ آئندہ سے جسکو ہماری نوکری کرنی ہو وہ اس طریقے پر نوکری کرے جو اب ہم اپنے آخری وائسرائے کے ذریعہ سے بتاتے ہیں۔ اسکے بعد کسی نوکر کو پچھلے طریقوں پر نوکری کرنیکا حق باقی نہیں رہا، کیونکہ اب اگر وہ نئے طریقے کو نہیں مانتا اور پرانے طریقوں پر چل رہا ہے تو وہ دراصل آقا کا حکم نہیں مانتا بلکہ اپنے دل کا کہا مان رہا ہے، اسلیے وہ نوکری سے خارج ہے، یعنی مذہب کی زبان میں کافر ہو گیا ہے۔

یہ تو پچھلے انبیاء کے ماننے والوں کیلیے ہے۔ رہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو، تو ان پر اس مثال کا دوسرا حصہ صادق آتا ہے۔ اللہ نے جو شریعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہم کو بھیجی ہے، اسکو خدا کی شریعت ماننے والے، اور واجب التعمیل سمجھنے والے سب کے سب مسلمان ہیں۔ اب اگر اس شریعت کے احکام کو ایک شخص کسی طرح سمجھتا ہے، اور دوسرا کسی اور طرح، اور دونوں اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس پر عمل کرتے ہیں، تو چاہے ان کے عمل میں کتنا ہی فرق ہو، ان میں سے کوئی بھی نوکری سے خارج نہوگا، اسلیے کہ ان میں سے ہر ایک جس طریقہ پر چل رہا ہے، یہی سمجھ کر تو چل رہا ہے کہ یہ آقا کا حکم ہے۔ پھر ایک نوکر کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ میں تو نوکر ہوں اور فلاں شخص نوکر نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ بس یہی کہہ سکتا ہے کہ میں نے آقا کے حکم کا صحیح مطلب سمجھا، اور اُس نے صحیح نہیں سمجھا، مگر وہ اسکو نوکری سے خارج کر دینے کا ہرگز مجاز

نہیں ہے۔ جو شخص ایسی جرأت کرتا ہے وہ گویا خود آقا کا منصب اختیار کرتا ہے۔ وہ گویا یہ کہتا ہے کہ تو جس طرح آقا کے حکم کو ماننے پر مجبور ہے، اسی طرح میری سمجھ کو بھی ماننے پر مجبور ہے۔ اگر تو میری سمجھ کو نہ مانیگا تو میں اپنے اختیار سے تجھ کو آقا کی نوکری سے خارج کردونگا۔ غور کرو! یہ کتنی بڑی بات ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو شخص کسی مسلمان کو ناحق کافر کہے گا اس کا قول خود اسی پر پلٹ جائیگا"۔ کیونکہ مسلمان کو تو خدا نے اپنے حکم کا غلام بنایا ہے اور یہ شخص کہتا ہے کہ نہیں، تم میری سمجھ اور میری رائے کی بھی غلامی کرو، یعنی صرف خدا ہی تمہارا خدا نہیں ہے، بلکہ میں بھی چھوٹا خدا ہوں، اور میرا حکم نہ مانوگے تو میں اپنے اختیار سے تم کو خدا کی بندگی سے خارج کردونگا چاہے خدا خارج کرے یا نہ کرے۔ ایسی بڑی بات جو شخص کہتا ہے اس کے کہنے سے چاہے دوسرا مسلمان کافر ہو یا نہ ہو، مگر وہ خود تو اپنے آپ کو کفر کے خطرے میں ڈال ہی دیتا ہے۔

خطبۂ ثانیہ | الحمد للہ العلی العظیم، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم۔

حاضرین! آپ نے دین اور شریعت کا فرق اچھی طرح سمجھ لیا۔ اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بندگی کے طریقوں میں اختلاف ہوجانے سے دین میں اختلاف نہیں ہوتا، بشرطیکہ آدمی جس طریقہ پر عمل کرے نیک نیتی کیساتھ یہ سمجھ کر عمل کرے کہ خدا اور اس کے رسول نے وہی طریقہ بتایا ہے جس پر وہ عامل ہے۔

اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ دین اور شریعت کے اس فرق کو نہ سمجھنے سے آپ کی جماعت میں کتنی خرابیاں واقع ہو رہی ہیں۔

مسلمانوں میں نماز پڑھنے کے مختلف طریقے ہیں۔ ایک شخص سینے پر ہاتھ باندھتا ہے دوسرا ناف پر باندھتا ہے۔ ایک شخص امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتا ہے۔ دوسرا نہیں پڑھتا۔ ایک شخص

آمین زور سے کہتا ہے، دوسرا آہستہ کہتا ہے۔ ان میں سے ہر شخص جس طریقہ پر چل رہا ہے، یہی سمجھ کر چل رہا ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ اسلیے نماز کی صورتیں مختلف ہونے کے باوجود دونوں حضور ہی کے پیرو ہیں۔ مگر جن ظالموں نے شریعت کے ان مسائل کو دین سمجھ رکھا ہے انہوں نے محض اپنی طریقوں کے اختلاف کو دین کا اختلاف سمجھ لیا، اپنی جماعتیں الگ کرلیں، اپنی مسجدیں الگ کرلیں، ایک نے دوسرے کو گالیاں دیں، مسجدوں سے مار مار کر نکال دیا، مقدمے بازیاں کیں، پارٹی بندیاں کیں، اور رسول اللہ کی امت کو ٹکڑے ٹکڑے کرڈالا۔

اس سے بھی لڑنے اور لڑانے والوں کے دل ٹھنڈے نہ ہوئے، تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک نے دوسرے کو کافر اور فاسق اور گمراہ کہنا شروع کردیا۔ ایک شخص قرآن سے یا حدیث سے ایک بات اپنی سمجھ کے مطابق نکالتا ہے، تو وہ اس کو کافی نہیں سمجھتا کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے اس پر عمل کرے۔ بلکہ یہ بھی ضروری سمجھتا ہے کہ دوسروں سے بھی اپنی سمجھ زبردستی تسلیم کرائے اور اگر وہ اسے تسلیم نہ کریں تو انکو خدا کے دین سے خارج کردے۔

آپ مسلمانوں میں یہ بہت سے فرقے جو دیکھ رہے ہیں یہ سب اپنی اپنی سمجھ کے مطابق قرآن و حدیث کی تعلیم کو مانتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک کی سمجھ صحیح ہو اور دوسرے کی سمجھ غلط ہو۔ میں بھی ایک طریقہ کا پیرو ہوں، اور اس کو صحیح سمجھتا ہوں، اور اس کے خلاف جو لوگ ہیں ان سے بحث بھی کرتا ہوں، تاکہ جو بات میرے نزدیک صحیح ہے وہ ان کو سمجھاؤں اور جس بات کو میں غلط سمجھتا ہوں اسے غلط ثابت کردوں۔ لیکن کسی شخص کی سمجھ کا غلط ہونا اور بات ہے اور اس کا دین سے خارج ہوجانا دوسری بات۔ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق شریعت پر عمل کرنیکا ہر مسلمان کو حق ہے۔ اگر دس مسلمان دس مختلف طریقوں پر عمل کریں، تو جب تک وہ شریعت کو

مانتے ہیں، وہ سب مسلمان ہی ہیں، ایک ہی امت ہیں، انکی جماعتیں الگ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ مگر جو لوگ اس چیز کو نہیں سمجھتے وہ اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر فرقے بناتے ہیں، ایک دوسرے سے کٹ جاتے ہیں، اپنی نمازیں اور مسجدیں الگ کر لیتے ہیں، ایک دوسرے سے شادی بیاہ، میل جول، اور ربط ضبط بند کر دیتے ہیں، اور اپنے اپنے ہم مذہبوں کے جتھے اس طرح بنا لیتے ہیں کہ گویا ہر جتھا ایک الگ امت ہے۔

آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس فرقہ بندی سے مسلمانوں کو کتنا نقصان پہنچا ہے۔ کہنے کو مسلمان ایک قوم ہیں۔ ہندوستان میں انکی آٹھ کروڑ کی تعداد ہے۔ اتنی بڑی قوم اگر واقعی ایک ہو اور پورے اتفاق کیساتھ کام کرے تو دنیا میں کون اتنا دم رکھتا ہے جو اس قوم کو نیچا دکھا سکے مگر حقیقت میں اس فرقہ بندی کی بدولت اس قوم کے سینکڑوں ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ یہ سخت سے سخت مصیبت کے وقت بھی مل کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ ایک فرقے کا مسلمان دوسرے فرقے والوں سے اتنا ہی تعصب رکھتا ہے، جتنا ایک یہودی ایک عیسائی سے رکھتا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایسے واقعات دیکھنے میں آئے ہیں کہ ایک فرقے والے نے دوسرے فرقے والے کو نیچا دکھانے کیلیے کفار کا ساتھ دیا ہے۔ ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کو آپ ہندوستان میں مغلوب دیکھ رہے ہیں تو تعجب نہ کیجیے یہ ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ ان پر وہ عذاب نازل ہوا ہے جسکو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پاک میں اس طرح بیان کیا ہے کہ:

أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ۔

یعنی اللہ کے عذاب کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک قوم مختلف فرقوں میں بٹ جائے اور آپس ہی میں کٹ مرے۔

بھائیو! یہ عذاب جس میں سارے ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں، اس کے آثار مجھے پنجاب میں سب سے زیادہ نظر آرہے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کے فرقوں کی لڑائیاں ہندوستان کے ہر حصہ سے زیادہ ہیں، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ پنجاب کی آبادی میں کثیر التعداد ہونے کے باوجود آپ چوٹوں پر چوٹیں کھاتے چلے جارہے ہیں۔ اگر آپ اپنی خیر چاہتے ہیں تو ان جتھوں کو توڑ دیجئے ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہیے، اور ایک امت بن جائیے۔ خدا کی شریعت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر اہلِ حدیث، اور حنفی، اور دیوبندی اور بریلوی، اور شیعہ اور سنی الگ الگ امتیں بن جائیں۔ یہ امتیں جاہل پیشواؤں کی بنائی ہوئی ہیں۔ ورنہ خدا نے تو ان سب کو ایک امت بنایا تھا۔ یہ اپنے اپنے طریقہ پر نماز پڑھ کر بھی ایک جماعت بن سکتے ہیں۔ اپنے مذہب کے مطابق چل کر بھی ایک امت بنکر رہ سکتے ہیں۔ خدا انکی عقلوں پر سے پردے اٹھائے اور انہیں اس عذاب سے نجات دے جس میں یہ محض اپنی غلط فہمی کی وجہ سے مبتلا ہیں۔

درود وسلام و دعاء

مطبوعات

مظلوم قوم | تالیف جناب مسلم بی۔ اے۔ ضخامت ۴۶ صفحات، قیمت ۵/

ملنے کا پتہ :۔ سکرٹری انجمن خادم المسلمین۔ بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔

ہندوستان کی چھوت چھات انسانیت کے چہرہ کا سب سے زیادہ بدنما داغ ہے۔ اس آسمان کے نیچے اچھوتوں سے بڑھکر شاید ہی کوئی قوم مظلوم ہو۔ ہندو دھرم انھیں چوپایوں سے زیادہ ذلیل سمجھتا ہے، ذلیل رہنے پر مجبور کرتا ہے، اور انکو اتنا گرا دیتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ناپاک سمجھنے لگتے ہیں۔ موجودہ دور کی علمی اور سیاسی بیداری نے قدیم زمانے کے نسلی اور لونی امتیاز کی اس بدترین یادگار کو سخت ٹھوکر لگائی اور ہزارہا برس کی پسی پسائی قوم اس بے رحمانہ تشدد کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر امبیدکر اور دوسرے اچھوت لیڈروں نے نہایت کھلے لفظوں میں ہندو دھرم سے بیزاری اور بغاوت کا اعلان کردیا اور اپنے لیے امن کا کوئی واقعی گہوارہ ڈھونڈھنے لگے۔

یہ کتاب انھیں مظلوموں کو دعوت امن دینے کیلیے لکھی گئی ہے جس میں مولف نے نہایت ہمدردانہ طریقے سے انھیں سمجھایا ہے کہ ویدوں اور منوسمرتی کی تعلیمات اور ہزاروں برس کی قومی روایات سے جو ہندو سوسائیٹی بنی ہے، وہ اسوقت تک تم کو اپنے دائرے میں مساوات کا درجہ نہیں دے سکتی جب تک کہ وہ خود اپنے آپ کو فنا نہ کردے۔ اسکے بعد انہوں نے سوامی دیانند جی کی بے سروپا تاویلات اور گاندھی جی کی مدبرانہ سیاست بازیوں کی قلعی بھی کھولی ہے اور بتایا ہے کہ ان طریقوں سے دراصل سونے والوں کو تھپکیاں دی جارہی ہیں تاکہ وہ پھر اپنے خواب دوشین میں غرق ہو جائیں۔ اولاً تو یہ اصلاحی دعاوی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے اور اگر ہو بھی جائیں

تب بھی ان غریبوں کا ناسورِ غم بھر نہیں سکتا۔ یعنی اب بھی ان کی گہرائی میں وہی ذہنیت موجود ہے جسکے طفیل ہزار ہا برس سے یہ کروڑوں مخلوق انسان ہوتے ہوئے بھی انسان نہیں ہے۔ یہی حال عیسائیت کا ہے جو چاندی سونے کے چمکدار سکوں سے تواضع کرنے کیلیے تو تیار کھڑی ہے لیکن درحقیقت یہاں بھی چرچ میں نہنچ کر کالے گورے کا سوال پیدا ہوجاتا ہے۔ ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد مولف نے انکی توجہ اسلام کی طرف مبذول کرائی ہے اور اسکی تعلیمات وعقائد بیان کرکے انھیں بتایا ہے کہ دیکھو تمہیں سچی عزت اور کامل مساوات صرف اسلام بخش سکتا ہے اسلام نام ہی اس چیز کا ہے جسے تم بیقرار ہو ہو کر ڈھونڈھ رہے ہو، اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہر انسان کو سربلندی عطا کرے۔ اسلام ظلم کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

فاضل مولف اپنے فرض سے سبکدوش تو ہو گئے ہیں۔ مگر شائد انہیں معلوم نہیں کہ اسلام میں خوبیوں کا موجود ہونا اصل مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ اچھوت ہوں یا دوسرے غیر مسلم، یا خود ہماری اپنی قوم کے عوام۔ ان کو اُس اسلام سے معاملہ نہیں پیش آتا جو کتاب میں ہے، بلکہ اجتماعی زندگی کے اس نظام سے معاملہ پیش آتا ہے جو عمل کی دنیا میں اس وقت نافذ ہے۔ یہ نظام اگر خالص اسلامی ہوتا تو ہمارے بیان کرنے کی حاجت بھی نہ ہوتی، ہر شخص اسلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا، اپنے تمام حواس سے محسوس کرتا، اور بجز ان لوگوں کے جو ضد اور شقاق کے مریض ہیں، شائد ہی کوئی اسلام میں جذب ہونے سے بچا رہ جاتا۔ لیکن ساری خرابی یہی ہے کہ ہمارا نظام اجتماعی اسلام کی بنیادوں سے بہت ہٹ گیا ہے، اور ہم نے خود وہ امراض اپنے اندر پال رکھے ہیں جن میں جاہل قومیں گرفتار تھیں اور ہیں۔ لہذا مسلمانوں کو غیر مسلموں کے سامنے کتابی اسلام پیش کرنے سے پہلے خود عملی اسلام اختیار کرنا چاہیے۔

مقروض قوم	تالیف جناب مسلم بی۔ اے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت ۸/

پتہ :- انجمن خادم المسلمین - بیرون لوہاری دروازہ - لاہور

یہ کتاب ہندوستان بالخصوص پنجاب کے مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی پر ایک مبسوط تبصرہ ہے - مولف نے پہلے اقتصادیات عالم پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ آج ہر ملک اور قوم کی قدر و عظمت اسکی اقتصادی حالت سے متعین ہوتی ہے - مسلمان اس میدان میں سب سے پیچھے ہیں اس لیے سب کا تختہ مشق ہیں - انکے اندر تقدیر، توکل اور صبر کے من گھڑت اور غیر اسلامی تصورات اس طرح جم گئے ہیں کہ اپنی ذلت اور کس مپرسی کا احساس بھی اب ان سے فنا ہو رہا ہے حالانکہ جملہ مذاہب میں صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے، جو دنیا کو دارالعمل اور مزرعۃ الآخرہ قرار دیتا ہے اور اس کی تعلیمات سراسر کسب و مجاہدہ پر ابھارتی ہیں - اسی سلسلہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ صبر و توکل اور تقدیر کی اصل حقیقت کیا ہے - اسکے بعد مولف نے مسلمانوں کے اندر احساس خودی اور اعتماد علی النفس پیدا کرنیکی کوشش کی ہے، قوم کے اندر بددلی پھیلانے والے مرثیہ خوانوں کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے، اور مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اٹھیں، زمانہ کا ساتھ دیں، موجودہ نظام معاشی و معاشرتی کو اپنے اندر جذب کریں، تجارت، زراعت اور صنعت کے سرچشموں پر قابض ہو کر اپنی زندگی کا سامان فراہم کریں -

یہاں پہنچ کر مولف سیدھے چلتے چلتے یکایک بھٹک گئے ہیں - اُن کا قومی درد قابلِ احترام اور نیت قابلِ صد احترام، لیکن افسوس ہے کہ اپنی بحث کے اس مرحلہ پر پہنچ کر انکا قلم اپنا نہیں رہ گیا، بلکہ مغربی جادو کے اشارہ پر بے اختیار ہو گیا ہے - وہ بالکل بھول گئے کہ کچھ ہمارے بھی نظریات زندگی ہیں، فکر و شعور اسلامی بھی کوئی چیز ہے، اسلام نے بھی کوئی معاشی اور معاشرتی نظام ہمیں دیا ہے -

بینک کے سود کو آپ قوم کی سرسبزی اور خوشحالی کا ذریعہ قرار دیکر مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ

اگرچہ سود حرام ہے لیکن "دار الحرب" ہند میں جائز ہے۔ نیز بینک کے سود میں تو کوئی حرمت ہی نہیں۔ وہ مفید ہے، ضروری ہے، اسکا سسٹم سرتاپا رحمت ہے، اس لیے مسلمانوں کو بینک اور کوآپرٹیو سوسائٹیز سے بیش از بیش فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اپنے اس خیال کو اسلامی رنگ دینے میں انہوں نے بہت زورِ قلم صرف کیا ہے اور عجیب عجیب تاویلیں کی ہیں۔ پہلے تو آپ قرضہ کی دو قسمیں کرتے ہیں، "مفید اور غیر مفید"، پھر مفید قرضہ کے حدود میں بینکنگ سسٹم اور تجارتی سود کو داخل کرتے ہیں، پھر فرماتے ہیں کہ آیتہ "ومن یقرض اللہ قرضاحسنا" میں "قرض حسن" سے یہی "مفید قرض" مراد ہے، جس پر ہلکی شرح سود لگائی گئی ہو، اور اسکے سراسر رحمت ہونے میں کیا شبہ! دوسری دلیل یہ ہے کہ ربٰو انسان کے نفس میں جن رذائل کو پیدا کرتا ہے اور جو اسکی حرمت کا باعث ہیں وہ رذائل اس سود سے بالکل نہیں پیدا ہوتے، اخلاق پر اسکی کوئی زد نہیں پڑتی۔ تیسری بات یہ ہے کہ اب اسکے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نہیں ہے، اور "اضطرار" حرمت کو بھی حلت سے بدل دیتا ہے۔ آخری سہارا جس پر قدرۃً آپ کو سب سے زیادہ اعتماد ہے چند علما اور بعض مذہبی انجمنوں کا فتویٰ ہے۔

اس مسئلہ پر "ترجمان القرآن" کے گذشتہ اوراق میں کافی لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی انشاءاللہ لکھا جائیگا۔ سرِ دست مسلم صاحب سے ہم صرف اتنا ہی عرض کرتے ہیں کہ دینی تصورات اور اسلامی نظریات پر پوری بصیرت کے ساتھ غور کرنے سے پہلے جو لوگ قوم کی نمائندگی کیلیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہ اس پر بڑا ہی ظلم کرتے ہیں۔ آیتہ "قرضاحسنا" سے آپنے جو فائدہ اٹھانا چاہا ہے وہ تحریف معنوی کی نہایت کریہ مثال ہے۔ مسلمانوں کی اجتماعی معصیت کو "حالت اضطرار" قرار دینا اور بینک کے سود کو ربٰو کی حد سے خارج کرنا روح اسلام سے انتہائی بے خبری اور عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ اسلام کا حال تو یہ ہے کہ مردے کو گھاس میں لپیٹ کر دفن کر دینا پڑتا ہے، مگر آنحضرت صلعم کفن خریدنے کیلیے قرض لینے کی اجازت نہیں دیتے، اور آپ ہیں کہ سودی قرضہ کو رحمت قرار دے رہے ہیں

یا للعجب! رہا دارالحرب تو اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دارالحرب اس لیے نہیں رہا کہ اس سے ہجرت کی جائے یا اسکو دارالاسلام بنانے کی جدوجہد کی جائے، بلکہ صرف اسلیے رہ گیا ہے کہ اس میں قیام کر کے شریعت کی ساری بندشیں اقوالِ فقہاء کا سہارا لے کر توڑ ڈالی جائیں، اور "مسلم غیر مسلم" بنکر رہنے کیلیے جتنی سہولتوں کی ضرورت ہو وہ سب فراہم کر لی جائیں۔ حیرت ہے اُن پیشوایانِ دین پر جنکے ہاتھوں میں افتا کا قلم ہے یعنی خدا کی دی ہوئی وہ امانت جسکا مقصد ہی حدود اللہ کا قیام تھا، لیکن بُرے وقت کا کرشمہ دیکھیے کہ نگہبان خود ہی نقب لگا کر چوروں کو گھر میں گھس جانے کا اشارہ کر رہا ہے۔ کاش یہ لوگ اپنے اور غیر کے تصورات زندگی میں امتیاز کرتے۔ اسلامی نظامِ حیات عملی حیثیت سے تو متروک و مہجور ہو ہی گیا ہے۔ اب کم از کم اسکو علمی و فکری حیثیت ہی سے زندہ رہنے دیجیے۔ دیو مغرب کو بھینٹ دینے میں آخر کہاں تک فیاضی و دریادلی سے کام لیا جائیگا۔

معین المنطق | تالیف مولوی مفتی محمود حسن صاحب۔ ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت ۳؍

ملنے کا پتہ :- مولانا محمود حسن صاحب مفتی جامعہ حسینیہ راندیر۔ ضلع سورت۔

عربی کا موجودہ نصاب تعلیم ناقص اور منطق کا طرز تعلیم ناقص تر ہے۔ یہی مصیبت کیا کم تھی کہ ارسطو کے آستانہ سے ہمارا منطقی مذاق سر اٹھانے کیلیے تیار نہیں ہوتا۔ اس پر ستم یہ کہ کورس کی کتابیں اتنی مغلق اور طرز بیان اتنا پیچیدہ اور ناہموار ہے کہ بچوں کا دماغ اس چیستاں میں پھنس کر بالکل ماؤف ہو جاتا ہے۔ فاضل مولف کی یہ کوشش یقیناً قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائیگی کہ انہوں نے ان مضامین کو سہل تر اور عام فہم انداز میں ادا کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ معین المنطق اسی تخیل کا نقشِ اول ہے جس میں انہوں نے ایک حد تک عام نقائص کو دور کرنے اور مسائل کو سلجھے ہوئے انداز میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مسائل کو عبارت میں سمجھانے کے بعد نقشوں کے ذریعہ بھی ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ گھڑی ہوئی مثالوں کو چھوڑ کر عام گفتگو

سے فقروں اور روزمرہ کے واقعات سے مثالیں اخذ کی گئی ہیں۔

اگر زبان اور زیادہ اردو کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہوتی تو بچوں کا ذہن اسے اور زیادہ آسانی سے قبول کرتا۔

تعلیم دینیات حصہ اول و دوم | تالیفات مولوی ایم۔ اے رشید صاحب شَغَف سینائی، ضخامت ۳۲ و ۴۰ صفحات قیمت ۲/ و ۳/ ملنے کا پتہ:۔ منیجر دار الکتب۔ ڈاکخانہ کلٹی۔ ضلع بردوان۔

یہ دینی رسالے مکاتب کے ابتدائی درجوں کیلئے لکھے گئے ہیں جنکے اندر فقہ حنفی کے عام ضروری مسائل اور دینی عقائد و اعمال نہایت اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

ان رسائل میں مسئلوں کو عملی تعلیم، معلوماتی تعلیم اور زبانی تعلیم کے الگ الگ عنوان قائم کرکے تقسیم کر دیا گیا ہے، جس سے کتاب کی ترتیب میں بھی حسن پیدا ہو گیا ہے اور بچوں کیلئے سمجھنے اور یاد کرنے میں بھی آسانی پیدا ہو گئی ہے۔

بعض مقامات نظر ثانی کے محتاج ہیں مثلاً پہلے حصہ میں اس پانی کو جس سے وضو نہیں کر سکتے ناپاک پانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ تعبیر صحیح نہیں۔ اس سے بچوں کو قدرۃً شبہ ہو سکتا ہے کہ عرق گلاب اور شوربا جیسی چیزیں جن سے وضو جائز نہیں مطلق ناپاک ہیں اور ان کا استعمال ہر طرح سے ناجائز ہے۔ ماء طاہر، ماء مُطَہِّر اور ماء نجس کے باہمی فرق کو واضح کرکے بیان کرنا چاہیے۔ اسی طرح بدعت کی تعریف تو بہت صحیح کی گئی ہے لیکن مثالیں دیتے وقت بیجا تشدد سے کام لیا گیا ہے۔ بدعت مصطلحہ اور چیز ہے اور عام رسومات اور چیز ہیں۔

افسوس ہے کہ بدعت اور سنت کے حدود متعین کرنے میں عام طور پر بڑی سہل انگاری سے کام لیا جاتا ہے، اور اس مرض میں عوام سے زیادہ علماء و مشائخ مبتلا ہیں، جسکی وجہ سے کہیں

تو لوگوں پر خواہ مخواہ زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا گیا ہے، اور کہیں شریعت کی اصلی حدود توڑ ڈالی گئی ہیں۔

کتاب امثال آصف الحکیم تالیف مولٰنا حمید الدین صاحب فراہی رحمۃ اللہ۔ ضخامت ۵۵ صفحات، قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ:- دائرۂ حمیدیہ۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر۔ اعظم گڈھ۔

یہ کتاب مولٰنا نے عربی ادب کے مبتدیوں کیلیے تیار کی تھی۔ چھوٹے چھوٹے دلچسپ اخلاقی قصے ستھری اور سلیس عربی میں ادا کیے گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں مبتدیوں کیلیے اس سے اچھی عربی ریڈر اب تک نہیں لکھی گئی۔

سلطان العلوم مرتبہ مولوی عتیق احمدؒ صاحب صدیقی۔ ضخامت ۴۰ صفحات، شرح چندہ سالانہ ۱۲ر، طلبہ سے ۸ر۔ ملنے کا پتہ:- دفتر سلطان العلوم، دیوبند، سہارنپور۔

دار العلوم دیوبند کا دور صحافت سلطان العلوم کے نام سے از سر نو شروع ہوا ہے۔ یہ ماہانہ رسالہ تقریباً ایک سال سے نکل رہا ہے۔ اسے اکابر علماء دیوبند کا شرف قیادت اور مولانا عثمانی کی سرپرستی حاصل ہے۔ مضامین زیادہ تر مذہبی ہیں اور قریب قریب سب ہی اکابر کے قلم سے نکلے ہوئے۔ اکثر بلند معیار، مفید اور صحیح اسلامی تعلیمات پر مشتمل ہیں، بعض جماعتی احساس کے تحت لکھے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ادبی اور تاریخی مقالے بھی ہیں۔ آگے چل کر شاید سیاست حاضرہ کو بھی اس کے دامن میں جگہ ملے گی۔ عربی نظم شہید الحریۃ بہت خوب ہے۔ "اختلاف کا مذموم پہلو" کے عنوان سے جو نظم شائع ہوئی ہے اسکی تلخ نوائی حد سے بڑھ گئی ہے جو سلطان العلوم جیسے ذمہ دار اور متین رسالہ کے لیے کچھ زیب نہیں دیتی۔ تعاون علی الاثم سے مسلمان کو بچنا چاہیئے۔

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

اس کتاب میں ایڈیٹر ترجمان القرآن کے وہ سیاسی مضامین یکجا جمع کر کے شائع کیے گئے ہیں جو ترجمان القرآن کی اشاعتہائے سابقہ میں محرم ۱۳۵۶ھ سے رجب ۱۳۵۶ھ تک لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب اصل میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت، اور مستقبل کے امکانات پر ایک مدبرانہ تبصرہ ہے، جس سے مسلمانان ہند کے دل و دماغ میں ان کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ کوئی لکھا پڑھا مسلمان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہئے۔ یہ کتاب اصل لاگت پر فروخت کی جا رہی ہے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں۔

ایک روپے میں	۰ نسخے	علاوہ محصول ڈاک
نو روپے میں	۰ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار
پندرہ روپے میں	۱۰۰ نسخے	,,

نوٹ: محصول ڈاک فی نسخہ سات پیسے ہے۔ ریلوے پارسل کے ذریعہ کم از کم ۲۰ نسخے منگوانے میں فائدہ رہتا ہے۔

شعبۂ اشاعت دارالاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام مختصر فہرست مضامین حسبِ ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روحِ جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعتِ اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

۵- قوانینِ جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید۔ بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ۔ قیمت مجلد ۵؎ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰/ محصولڈاک ۲/ خرچ وی پی ۳/

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

سوھنی و تصاویر پرنٹر پریس لاہور دارالاسلام میں طبع ہوئے